گلستانِ ادب

بارھویں جماعت کے لیے اردو کی درسی کتاب

5257

विद्ययाऽमृतमश्नुते

एन सी ई आर टी
NCERT

نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ

NATIONAL COUNCIL OF EDUCATIONAL RESEARCH AND TRAINING

© NCERT not to be republished

5257-GULISTAN-E-ADAB
Textbook for Class XII

ISBN 81-7450-688-8

پہلا ایڈیشن

جنوری 2007	ماگھ 1928

دیگر طباعت

دسمبر 2014	پوش 1936
فروری 2019	ماگھ 1940
جولائی 2020	شراون 1942
نومبر 2021	اگہن 1943

PD 1T+5H SPA

© نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، 2007

قیمت: 255.00 ₹

جُملہ حقوق محفوظ

- ناشر کی پہلے سے اجازت حاصل کیے بغیر، اس کتاب کے کسی بھی حصے کو دوبارہ پیش کرنا، یادداشت کے ذریعے بازیافت کے سسٹم میں اس کو محفوظ کرنا یا برقیاتی، میکانیکی، فوٹو کاپینگ، ریکارڈنگ کے کسی بھی وسیلے سے اس کی ترسیل کرنا منع ہے۔
- اس کتاب کو اس شرط کے ساتھ فروخت کیا جارہا ہے کہ اسے ناشر کی اجازت کے بغیر، اس شکل کے علاوہ جس میں کہ یہ چھاپی گئی ہے یعنی، اس کی موجودہ جلد بندی اور سرورق میں تبدیلی کر کے، تجارت کے طور پر نہ تو مستعار دیا جاسکتا ہے، نہ دوبارہ فروخت کیا جاسکتا ہے، نہ کرایہ پر دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی تلف کیا جاسکتا ہے۔
- کتاب کے صفحہ پر جو قیمت درج ہے وہ اس کتاب کی صحیح قیمت ہے۔ کوئی بھی نظرثانی شدہ قیمت چاہے وہ ربر کی مہر کے ذریعے یا چِپّی یا کسی اور ذریعے ظاہر کی جائے تو وہ غلط متصوّر ہوگی اور ناقابلِ قبول ہوگی۔

این سی ای آر ٹی کے پبلی کیشن ڈویژن کے دفاتر

این سی ای آر ٹی کیمپس
سری اروندو مارگ
نئی دہلی - 110016 **فون** 011-26562708

108,100 فِٹ روڈ ہوسڈے کیرے **ہیلی**
ایکسٹینشن بناشنکری III اسٹیج
بینگلورو - 560085 **فون** 080-26725740

نوجیون ٹرسٹ بھون
ڈاک گھر، نوجیون
احمد آباد - 380014 **فون** 079-27541446

سی ڈبلیو سی کیمپس
بمقابل ڈھانکل بس اسٹاپ، پانی ہاٹی
کولکاتا - 700114 **فون** 033-25530454

سی ڈبلیو سی کامپلیکس
مالی گاؤں
گواہاٹی - 781021 **فون** 0361-2674869

اشاعتی ٹیم

ہیڈ، پبلی کیشن ڈویژن	انوپ کمار راجپوت
چیف ایڈیٹر	شویتا اُپّل
چیف پروڈکشن آفیسر	ارون چتکارا
چیف بزنس منیجر	وپن دیوان
ایڈیٹر	سید پرویز احمد
پروڈکشن آفیسر	عبدالنعیم

سرورق اور آرٹ
اروپ گپتا

این سی ای آر ٹی واٹر مارک 80 جی ایس ایم کاغذ پر شائع شدہ

سکریٹری، نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ، شری اروندو مارگ، نئی دہلی نے شری وِرنداون گرافکس پرائیویٹ لمیٹڈ، E-34 سیکٹر 7، نوئیڈا-201 301 میں چھپوا کر پبلی کیشن ڈویژن سے شائع کیا۔

پیش لفظ

'قومی درسیات کے خاکہ—2005' میں سفارش کی گئی ہے کہ بچّوں کی اسکول کی زندگی، ان کی باہر کی زندگی سے ہم آہنگ ہونی چاہیے۔ یہ زاویۂ نظر، کتابی علم کی اس روایت کی نفی کرتا ہے جس کے باعث آج تک ہمارے نظام میں گھر اور سماج کے درمیان فاصلے حائل ہیں۔ نئے قومی درسیات کے خاکے پر مبنی نصاب اور درسی کتابیں اسی بنیادی خیال پر عمل آوری کی ایک کوشش ہے۔ اس کوشش میں مختلف مضامین کو ایک دوسرے سے الگ رکھنے اور رٹ کر پڑھنے کے طریقۂ کار کی حوصلہ شکنی بھی شامل ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ان اقدامات سے قومی تعلیمی پالیسی 1986 میں مذکور 'تعلیم کے طفل مرکوز نظام' کی طرف مزید پیش رفت ہوگی۔

اس کوشش کی کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ سبھی اسکولوں کے پرنسپل اور اساتذہ بچوں میں اپنے تاثرات خود ظاہر کرنے اور ذہنی سرگرمیوں اور سوالوں کے ذریعے سیکھنے کی ہمّت افزائی کریں۔ ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ بچوں کو اگر موقع، وقت اور آزادی دی جائے تو وہ بڑوں سے حاصل شدہ معلومات سے وابستہ ہوکر، نئی معلومات مرتّب کرتے ہیں۔ آموزش کے دوسرے ذرائع اور محل وقوع کو نظر انداز کرنے کے بنیادی اسباب میں سے ایک اہم سبب مجوّزہ درسی کتاب کو امتحان کے لیے واحد ذریعہ بنانا ہے۔ بچّوں کے اندر تخلیقی صلاحیت اور پیش قدمی کے رجحان کو فروغ دینا اسی وقت ممکن ہے جب ہم آموزشی عمل میں بچوں کو بحیثیت شریک کار قبول کریں اور اُن سے اسی طرح پیش آئیں۔ انھیں محض مقررہ معلومات کا حامل نہ سمجھیں۔

یہ مقاصد اسکول کے معمولات اور طریقۂ کار میں معقول تبدیلی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ روزمرہ نظام الاوقات (Time-Table) میں لچک اُسی قدر ضروری ہے جتنی کہ سالانہ کیلینڈر کے نفاذ میں سخت محنت کی، تاکہ مطلوبہ ایام کو حقیقتاً تدریس کے لیے وقف کیا جاسکے۔ تدریس اور اندازِ قدر کے طریقوں سے بھی اس امر کا تعین ہوگا کہ یہ درسی کتاب، بچوں میں ذہنی تناؤ اور اکتاہٹ کا ذریعہ بننے کے بجائے ان کی اسکولی زندگی کو خوش گوار بنانے میں کس حد تک مؤثر ثابت ہوتی ہے۔ نصابی بوجھ کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے نصاب سازوں نے مختلف سطحوں پر معلومات کی تشکیلِ نو اور اسے نیا رخ دینے کی غرض سے بچوں کی نفسیات اور تدریس کے لیے دستیاب وقت پر زیادہ سنجیدگی کے ساتھ توجہ دی ہے۔ اس مخلصانہ کوشش کو مزید بہتر بنانے کے لیے یہ

© NCERT not to be republished

درسی کتاب سوچنے اورمحسوس کرنے کی تربیت، چھوٹے گروپوں میں بحث ومباحثہ کرنے اور عملاً انجام دی جانے والی سرگرمیوں کو زیادہ اوّلیت دیتی ہے۔

این سی ای آر ٹی اس کتاب کے لیے تشکیل دی جانے والی ''کمیٹی برائے درسی کتاب'' کی مخلصانہ کوششوں کی شکرگزار ہے۔ کونسل زبانوں کی مشاورتی گروپ کے چیئرمین پروفیسر نامور سنگھ اور اس کتاب کے خصوصی صلاح کار پروفیسر شمیم حنفی کی ممنون ہے۔ اس درسی کتاب کی تیاری میں جن اساتذہ نے حصّہ لیا ہم ان کے متعلقہ اداروں کے بھی شکرگزار ہیں۔ ہم ان سبھی اداروں اور تنظیموں کے بھی احسان مند ہیں جنھوں نے اپنے وسائل، مآخذ اور عملے کی فراہمی میں فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ ہم وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کے شعبے برائے ثانوی اور اعلیٰ ثانوی تعلیم کی جانب سے پروفیسر مرنال مری اور پروفیسر جی۔ پی۔ دیش پانڈے کی سربراہی میں تشکیل شدہ نگراں کمیٹی (مانیٹرنگ کمیٹی) کے اراکین کا بھی خصوصی شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اپنا قیمتی وقت اور تعاون ہمیں دیا۔ باضابطہ اصلاح اور اپنی اشاعت کے معیار کو مسلسل بہتر بنانے کے مقصد کی ایک تنظیم کے طور پر این سی ای آر ٹی، تمام مشوروں اور آرا کا خیر مقدم کرتی ہے تاکہ کتاب کو مزید غور وفکر کے بعد اور زیادہ کارآمد اور بامعنی بنایا جاسکے۔

نئی دہلی
دسمبر 2006

ڈائریکٹر
نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ

© NCERT not to be republished

اس کتاب کے بارے میں

ہمارے اسکولوں میں زبان وادب کے نصابات، ابتدائی سے لے کر ثانوی اور اعلیٰ ثانوی سطح تک پڑھائے جاتے ہیں۔ بارھویں جماعت کے لیے تیار کی جانے والی یہ درسی کتاب اس سلسلے کی آخری کڑی ہے۔ زیرِ نظر کتاب 'گلستانِ ادب' مختلف اصناف سے منتخب کیے جانے والے متون پر مشتمل ہے اور انھیں تفصیل کے ساتھ پڑھایا جانا ہے۔ اس کتاب کے ساتھ ایک اور معاون درسی کتاب 'خیابانِ اردو' بھی تیار کی گئی ہے۔ ان کتابوں کو تیار کرتے وقت اس بات پر خاص توجہ دی گئی ہے کہ بارھویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے طلبا اپنی روایت کے تمام نمائندہ مراحل اور پہلوؤں کا شعور حاصل کرلیں۔ اُردو کی ادبی روایت اور تاریخ کا پورا سفر کئی صدیوں پر پھیلا ہوا ہے، اس طویل سلسلے کو ایک یا دو کتابوں میں سمیٹنا آسان نہیں تھا۔ اسی لیے بارھویں جماعت کی اس کتاب میں صرف اُن اصناف اور ادبی تخلیقات کو لیا گیا ہے جن کی تفہیم وتعبیر کے لیے زندگی کے تجربے اور فکر میں کسی قدر پختگی ضروری ہے۔ اس سے پہلے والی کتابوں میں ہمارے طلبا، مختلف قدیم وجدید اصنافِ نظم ونثر سے متعارف ہوتے آئے ہیں اور وہ تمام انتخابات بچّوں کی تدریجی ذہنی ترقی کو سامنے رکھ کر مرتّب کیے گئے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب ہماری بنیادی ادبی صنفوں کا احاطہ کرتی ہے۔ اس سلسلے کی سپلیمنٹری کتاب کے دائرے میں، اُس اہم ادبی سرمائے کو سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے، جسے کلاس روم میں تفصیل سے پڑھانا ممکن نہیں اور جسے طلبا اپنے طور پر بھی پڑھ سکتے ہیں۔

© NCERT not to be republished

بھارت کا آئین

تمہید

ہَم بھارت کے عوام متانت وسنجیدگی سے عزم کرتے ہیں کہ بَھارَت کو ایک مقتدر، سمَاج وَادی، غیر مَذہَبی عَوامی جَمہُوریَہ بنائیں اور اس کے تمام شہریوں کے لیے حاصل کریں۔

انصاف سماجی، معاشی اور سیاسی

آزادی خیال، اظہار، عقیدہ، دین اور عبادت

مساوات بہ اعتبار حیثیت اور موقع اور ان سب میں

اخوت کو ترقی دیں جس سے فرد کی عظمت اور قوم کے اتحاد اور سالمیت کا تیقن ہو۔

اپنی آئین ساز اسمبلی میں آج چھبیس نومبر 1949ء کو یہ آئین ذریعہ ہذا اختیار کرتے ہیں، وضع کرتے ہیں اور اپنے آپ پر نافذ کرتے ہیں۔

1۔ آئینی (بیالیسویں ترمیم) ایکٹ، 1976 کے سیکشن 2 کے ذریعہ ''مقتدر عوامی جمہوریہ'' کی جگہ (3-1-1977 سے)
2۔ آئینی (بیالیسویں ترمیم) ایکٹ، 1976 کے سیکشن 2 کے ذریعہ ''قوم کے اتحاد'' کی جگہ (3-1-1977 سے)

© NCERT not to be republished

کمیٹی برائے درسی کتاب

چیئرمین، مشاورتی کمیٹی برائے زبان

نامورسنگھ، پروفیسر ایمیرٹیس، جواہرلعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

خصوصی صلاح کار

شمیم حنفی، پروفیسر ایمیرٹیس، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

چیف کوآرڈی نیٹر

رام جنم شرما، سابق پروفیسر اور ہیڈ، ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن اِن لینگوئیجز، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی

اراکین

خلیق انجم، جنرل سکریٹری، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

سید حنیف احمد نقوی، پروفیسر (ریٹائرڈ)، بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی

شمس الحق عثمانی، پروفیسر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

شمیم احمد، ٹی جی ٹی، کریسنٹ اسکول، دریا گنج، نئی دہلی

شہپر رسول، ریڈر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

صادق، پروفیسر، دہلی یونیورسٹی، دہلی

صدیق الرحمٰن قدوائی، پروفیسر (ریٹائرڈ)، جواہرلعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

صفدر امام قادری، صدر شعبۂ اردو، کالج آف کامرس، پٹنہ

ظفر احمد صدیقی، ریڈر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عبدالحق، پروفیسر (ریٹائرڈ)، دہلی یونیورسٹی، دہلی

© NCERT not to be republished

عتیق اللہ، پروفیسر (ریٹائرڈ)، دہلی یونیورسٹی، دہلی
قاضی افضال حسین، پروفیسر اور صدر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
قاضی جمال حسین، پروفیسر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
کنیز وارثی، پی جی ٹی (ریٹائرڈ) گورنمنٹ سینئر سیکنڈری اسکول، نورنگر، نئی دہلی
محمد شاہد حسین، پروفیسر اور صدر شعبۂ اردو، جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

ممبر کوآرڈی نیٹر

محمد نعمان خاں، ریٹائرڈ پروفیسر، ڈپارٹمنٹ آف ایجوکیشن اِن لینگوئجیز، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی

© NCERT not to be republished

اظہارِ تشکر

اس کتاب میں خواجہ حسن نظامی کا انشائیہ ''مچھر''، سجاد ظہیر کی کتاب ''روشنائی'' کا انتخاب، کرشن چندر کے رپورتاژ ''پودے'' کا انتخاب، اخترالایمان کی آپ بیتی ''اس آباد خرابے میں'' کا انتخاب، رام لعل کا سفرنامہ ''زرد پتوں کی بہار'' کا انتخاب، کنھیا لال کپور کا مزاحیہ مضمون ''غالب جدید شعرا کی ایک مجلس میں''، احتشام حسین کا مضمون ''خوجی — ایک مطالعہ''، خورشید الاسلام کا مضمون ''امراؤ جان ادا''، قرۃ العین حیدر کا افسانہ ''فوٹو گرافر''، بلونت سنگھ کا ''لمحے''، سریندر پرکاش کا ''بجوکا''، احمد جمال پاشا کا خاکہ ''کلیم الدین احمد''، معین احسن جذبیؔ، جاں نثار اخترؔ، ناصر کاظمیؔ، راجندر منچندا بانیؔ کی غزلیں اور جمیل مظہری، سردار جعفری، ن۔م راشدؔ اور عمیقؔ حنفی کی نظمیں شامل ہیں۔کونسل ان سب کے وارثین کا شکریہ ادا کرتی ہے۔کتاب میں، اقبال مجید کا افسانہ ''سکون کی نیند''، شفیع جاوید کا ''میں، وہ'' اور شفیق فاطمہ شعریٰ کی نظم ''یادنگر'' شامل ہے، کونسل ان سبھی کی شکرگزار ہے۔

کتاب کی تیاری میں کاپی ایڈیٹر ہما خان، پروف ریڈر مسعود اظہر، ڈی ٹی پی آپریٹرس محمد وزیر عالم مصباحی، ساجد خلیل فلاحی اور کمپیوٹر اسٹیشن انچارج پرش رام کوشک نے پوری دل چسپی سے حصہ لیا ہے۔کونسل ان سب کا شکریہ ادا کرتی ہے۔

© NCERT not to be republished

بھارت کا آئین

حصہ III (دفعہ 12 سے 35)

(بعض شرائط، چند مستثنات اور واجب پابندیوں کے ساتھ)

بنیادی حقوق

کے ذریعہ منظور شدہ

حق مساوات

- قانون کی نظر میں اور قوانین کا مساویانہ تحفظ
- مذہب، نسل، ذات، جنس یا مقام پیدائش کی بنا پر عوامی جگہوں پر مملکت کے زیر انتظام
- سرکاری ملازمت کے لیے مساوی موقع
- چھوت چھات اور خطابات کا خاتمہ

حق آزادی

- اظہار خیال، مجلس، انجمن، تحریک، بودوباش اور پیشے کا
- سزا کے جرم سے متعلق بعض تحفظات کا
- زندگی اور شخصی آزادی کے تحفظ کا
- 6 سے 14 سال کی عمر کے بچوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم کا
- گرفتاری اور نظر بندی سے متعلق بعض معاملات کے خلاف تحفظ کا

استحصال کے خلاف حق

- انسانوں کی تجارت اور جبری خدمت کی ممانعت کے لیے
- بچوں کو خطرناک کام پر مامور کرنے کی ممانعت کے لیے

مذہب کی آزادی کا حق

- آزادیٔ ضمیر اور قبولِ مذہب اور اس کی پیروی اور تبلیغ
- مذہبی امور کے انتظام کی آزادی
- کسی خاص مذہب کے فروغ کے لیے ٹیکس ادا کرنے کی آزادی
- کلی طور سے مملکت کے زیر انتظام تعلیمی اداروں میں مذہبی تعلیم یا مذہبی عبادت کی آزادی

ثقافتی اور تعلیمی حقوق

- اقلیتوں کی اپنی زبان، رسم خط یا ثقافت کے مفادات کا تحفظ
- اقلیتوں کو اپنی پسند کے تعلیمی ادارے کے قیام اور ان کے انتظام کا حق

قانونی چارہ جوئی کا حق

- سپریم کورٹ یا کورٹ کی جانب سے ہدایات، احکام یا رٹ کے اجرا کو تبدیل کرانے کا حق

© NCERT not to be republished

ترتیب

پیش لفظ		*iii*
اس کتاب کے بارے میں		*v*

حصّۂ نثر

مکتوب نگاری		**2-9**
مرزا غالبؔ	منشی ہرگوپال تفتہؔ کے نام	3
مرزا غالبؔ	منشی نبی بخش حقیرؔ کے نام	8
تنقیدی مضمون		**10-23**
احتشام حسین	خوجی — ایک مطالعہ	11
خورشید الاسلام	امراؤ جان ادا	18
مختصر افسانہ		**24-71**
بلونت سنگھ	لمحے	26
قرۃ العین حیدر	فوٹوگرافر	37
سریندر پرکاش	بجوکا	47
اقبال مجید	سکون کی نیند	57
شفیع جاوید	میں، وہ	64
یادیں		**72-78**
سجّاد ظہیر	روشنائی (انتخاب)	73

© NCERT not to be republished

آپ بیتی			**79-87**
اختر الایمان	اس آباد خرابے میں	(انتخاب)	80
رپورتاژ			**88-94**
کرشن چندر	پودے	(انتخاب)	89
انشائیہ			**95-101**
خواجہ حسن نظامی	مچھّر		96
طنز و مزاح			**102-119**
کنھیّا لال کپور	غالبؔ جدید شعرا کی ایک مجلس میں		103
سفر نامہ			**120-127**
رام لعل	زرد پتّوں کی بہار	(انتخاب)	121
خاکہ			**128-140**
احمد جمال پاشا	کلیم الدین احمد		129

حصّۂ نظم

غزل		**142-162**
الطاف حسین حالیؔ	اب بھاگتے ہیں سایۂ عشقِ بتاں سے ہم	143
آرزوؔ لکھنوی	اوّل شب وہ بزم کی رونق، شمع بھی تھی پروانہ بھی	147
معین احسن جذبیؔ	زندگی ہے تو بہر حال بسر بھی ہوگی	150
جاں نثار اخترؔ	جب لگیں زخم تو قاتل کو دعا دی جائے	154
ناصر کاظمیؔ	یہ شب، یہ خیال و خواب تیرے	157
راجندر منچندا بانیؔ	زماں، مکاں تھے مرے سامنے بکھرتے ہوئے	160

© NCERT not to be republished

نظم 163-195

نظم طباطبائی	گورِ غریباں	165
اقبال	روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے	172
جمیل مظہری	ارتقا	176
ن۔م۔ راشد	زندگی سے ڈرتے ہو	180
عمیق حنفی	ملکِ بے سحر و شام	185
شفیق فاطمہ شعریٰ	یادنگر	189

طویل نظم 196-202

علی سردار جعفری	وقت کا ترانہ	197

© NCERT not to be republished

بھارت کا آئین

حصّہ 4 الف

بنیادی فرائض

بنیادی فرائض : 51 الف۔ بھارت کے ہر شہری کا یہ فرض ہوگا کہ وہ ——

(الف) آئین پر کاربند رہے اور اس کے نصب العین اور اداروں، قومی پرچم اور قومی ترانے کا احترام کرے؛

(ب) ان اعلیٰ نصب العین کو عزیز رکھے اور ان کی تقلید کرے جو آزادی کی تحریک میں قوم کی رہنمائی کرتے رہے ہیں؛

(ج) بھارت کے اقتدار اعلیٰ، اتحاد اور سالمیت کو مستحکم بنیادوں پر استوار کر کے ان کا تحفّظ کرے؛

(د) ملک کی حفاظت کرے اور جب ضرورت پڑے، قومی خدمت انجام دے؛

(ہ) مذہبی، لسانی اور علاقائی وطبقاتی تفرقات سے قطع نظر بھارت کے عوام الناس کے مابین یک جہتی اور عام بھائی چارے کے جذبے کو فروغ دے نیز ایسی حرکات سے باز رہے جن سے خواتین کے وقار کو ٹھیس پہنچتی ہو؛

(و) ملک کی ملی جلی ثقافت کی قدر کرے اور اُسے برقرار رکھے؛

(ز) قدرتی ماحول کو جس میں جنگلات، جھیلیں، دریا اور جنگلی جانور شامل ہیں، محفوظ رکھے اور بہتر بنائے اور جانداروں کے تئیں محبت وشفقت کا جذبہ رکھے۔

(ح) دانشورانہ رویے سے کام لے کر انسان دوستی اور تحقیقی واصلاحی شعور کو فروغ دے؛

(ط) قومی جائیداد کا تحفظ کرے اور تشدد سے گریز کرے؛

(ی) تمام انفرادی اور اجتماعی شعبوں کی بہتر کارکردگی کے لیے کوشاں رہے تاکہ قوم متواتر ترقی وکامیابی کی منازل طے کرنے میں سرگرم عمل رہے؛

(ک) ماں، باپ یا سرپرست جو بھی ہے، چھے سے چودہ سال تک کی عمر کے اپنے بچّے یا زیر ولایت، کو تعلیم کے مواقع فراہم کرے۔

© NCERT not to be republished

حصۂ نثر

- مکتوب نگاری
- تنقیدی مضمون
- مختصر افسانہ
- یادیں
- آپ بیتی
- رپورتاژ
- انشائیہ
- طنز و مزاح
- سفرنامہ
- خاکہ

© NCERT not to be republished

مکتوب نگاری

بعض اہلِ قلم نے مکتوب نگاری کو ایک لطیف فن قرار دیا ہے۔ ایسے خطوط بڑی تعداد میں موجود ہیں جن میں اعلیٰ تخلیقی ادب کی شان پائی جاتی ہے۔

مکتوب نگاری شخصی اظہار کی ایک شکل ہے۔ مکتوب نگار کا مخاطب کوئی ایک شخص ہوتا ہے جب کہ ادب کی دوسری اصناف میں ایک ساتھ کئی لوگ مخاطب ہوسکتے ہیں۔ کچھ ادیبوں نے ایسے عمدہ خط لکھے ہیں کہ اب مکتوب نگاری کو ایک ادبی صنف کا مرتبہ حاصل ہو چکا ہے۔ ایسے خطوط کا مطالعہ اس اعتبار سے اور بھی دل چسپ ہوجاتا ہے۔

مکتوب نگار کا مخاطب کوئی ہو، اگر مکتوب نگار کی تحریر میں کشش ہو تو خط ہر پڑھنے والے کے لیے دل چسپ ہوسکتا ہے۔ اچھے خطوط ادب پاروں کے طور پر پڑھے جاتے ہیں۔ اردو نثر کی روایت میں غالب، شبلی، مہدی افادی، چودھری محمد علی رودولوی، رشید احمد صدیقی، منٹو، میرا جی اور ابوالکلام آزاد وغیرہ کے خطوط نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

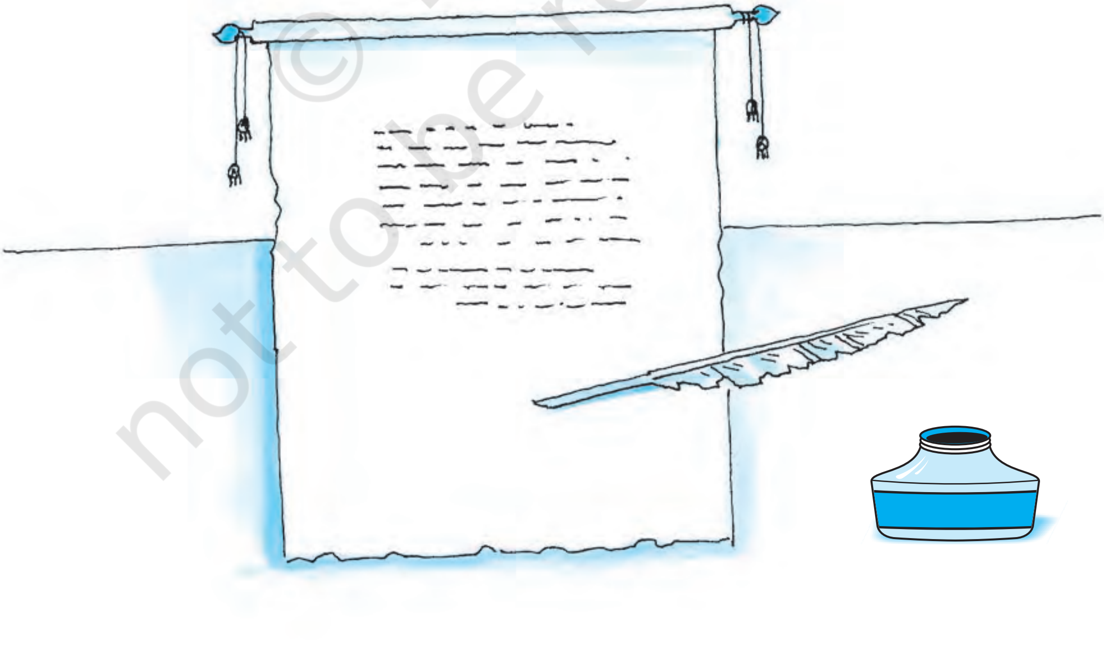

© NCERT not to be republished

مرزا غالبؔ

1797 تا 1869

غالبؔ نے نثر نگاری کا آغاز فارسی سے کیا۔ ان کی تین کتابیں 'پنج آہنگ'، 'مہر نیمروز' اور 'دستنبو' قابلِ ذکر ہیں۔ اردو میں بھی ان کے چار نثری رسالے ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ اُنھوں نے مختلف کتابوں پر دیباچے، تقریظیں اور کچھ متفرق تحریریں بھی لکھی تھیں۔ ان میں غالبؔ کی نثر عام طور پر صاف اور سادہ ہے لیکن ان کا سب سے بڑا نثری کارنامہ ان کے خطوط ہیں ۔ غالبؔ نے اردو خطوط نگاری کو ایک نیا راستہ دکھایا۔ بقول حالیؔ:

> ''مرزا کی اردو خط وکتابت کا طریقہ فی الواقع سب سے نرالا ہے۔ نہ مرزا سے پہلے کسی نے خط وکتابت میں اختیار کیا اور نہ ان کے بعد کسی سے اس کی پوری پوری تقلید ہوسکی۔''

غالبؔ نے مراسلے کو مکالمہ بنا دیا۔ ان کے اردو خطوط میں ان کی اپنی زندگی اور زمانے کے بہت دل چسپ نقشے سمٹ آئے ہیں۔ خاص طور پر 1857 کے آس پاس کا ماحول غالبؔ کے خطوط میں جس تفصیل کے ساتھ رونما ہوا ہے، اس کے پیشِ نظر، یہ خطوط ایک تاریخی مواد کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ غالبؔ کے اردو خطوط کے دو مجموعے 'عودِ ہندی' اور 'اردوئے معلّٰی' بہت مشہور ہوئے ۔ غالبؔ نے جو اسلوب اختیار کیا تھا اس کی نقل کسی سے بھی ممکن نہ ہوسکی ۔ واقعہ نگاری، منظر نگاری اور جذبات نگاری کی غیر معمولی مثالیں ان کے خطوط میں بکھری ہوئی ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ طنز ومزاح کا عنصر بھی غالبؔ کی نثر میں ایک خاص حیثیت رکھتا ہے۔

© NCERT not to be republished

5257CH01

منشی ہرگوپال تفتہ کے نام

صاحب!

تم جانتے ہو کہ یہ معاملہ کیا ہے اور کیا واقع ہوا؟ وہ ایک جنم تھا کہ جس میں ہم تم باہم دوست تھے اور طرح طرح کے ہم میں تم میں معاملاتِ مہر و محبت درپیش آئے۔ شعر کہے، دیوان جمع کیے۔ اُسی زمانے میں ایک بزرگ تھے کہ وہ ہمارے تمھارے دوستِ دلی تھے اور منشی نبی بخش اُن کا نام اور حقیرؔ تخلص تھا۔ ناگاہ، نہ وہ زمانہ رہا، نہ وہ اشخاص، نہ وہ معاملات، نہ وہ اختلاط، نہ وہ انبساط، بعد چند مدّت کے دوسرا جنم ہم کو ملا۔ اگر چہ صورت اس جنم کی بعینہٖ مثل پہلے جنم کے ہے، یعنی ایک خط میں نے منشی نبی بخش صاحب کو بھیجا، اُس کا جواب مجھ کو آیا اور ایک خط تمھارا کہ تم بھی موسوم بہ منشی ہرگوپال و متخلص بہ تفتہؔ ہو، آج آیا اور میں جس شہر میں ہوں، اُس کا نام بھی دلّی اور اُس محلّے کا نام بلّی ماروں کا محلّہ ہے، لیکن ایک دوست اُس جنم کے دوستوں میں سے نہیں پایا جاتا۔ واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان، اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر، کیا غریب، کیا اہلِ حرفہ۔ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہوگئے ہیں۔

اب پوچھو کہ تو کیوں کر مسکنِ قدیم میں بیٹھا رہا۔ صاحب بندہ! میں حکیم محمد حسن خاں مرحوم کے مکان میں نو دس برس سے کرایے پر رہتا ہوں اور یہاں قریب کیا بلکہ دیوار بہ دیوار ہیں گھر حکیموں کے اور وہ نوکر ہیں راجہ نرندر سنگھ بہادر والیِ پٹیالہ کے۔ راجا نے صاحبانِ عالی شان سے عہد لے لیا تھا کہ بر وقتِ غارتِ دہلی، یہ لوگ بچ رہیں۔ چناں چہ بعدِ فتح، راجا کے سپاہی یہاں آ بیٹھے اور یہ کوچہ محفوظ رہا ورنہ میں اور یہ شہر کہاں؟ مبالغہ نہ جاننا، امیر غریب سب نکل گئے۔ جو رہ گئے تھے، وہ نکالے گئے۔ جاگیردار، پنشن دار، دولت مند، اہلِ حرفہ، کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصّل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمانِ قلعہ پر شدّت ہے۔ اور بازپُرس اور داروگیر میں مبتلا ہیں، مگر وہ نوکر جو اس ہنگام میں نوکر ہوئے ہیں اور ہنگامے میں شریک رہے ہیں۔ میں غریب شاعر دس دس برس سے لکھنے اور شعر کی اصلاح دینے پر متعلق ہوا ہوں، خواہی اُس کو نوکری سمجھو، خواہی مزدوری جانو۔ اس فتنہ و آشوب میں کسی مصلحت میں، میں نے دخل نہیں دیا۔ صرف اشعار کی خدمت بجالاتا رہا اور نظر اپنی بے گناہی پر، شہر سے نکل گیا۔ میرا شہر میں ہونا

© NCERT not to be republished

حکام کو معلوم ہے، مگر چوں کہ میری طرف بادشاہی دفتر میں سے یا مخبروں کے بیان سے کوئی بات پائی نہیں گئی، لہٰذا طلبی نہیں ہوئی۔ ورنہ جہاں بڑے بڑے جاگیردار بلائے ہوئے یا پکڑے ہوئے آئے ہیں، میری کیا حقیقت تھی۔ غرض کہ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں، دروازے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ سوار ہونا اور کہیں جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے، شہر میں ہے کون جو آوے؟ گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں۔ جرنیلی بندوبست یازدہم مئی سے آج تک، یعنی شنبہ پنجم دسمبر ۱۸۵۷ء تک بہ دستور ہے۔ کچھ نیک و بد کا حال مجھ کو نہیں معلوم بلکہ ہنوز ایسے امور کی طرف حکام کو توجہ بھی نہیں۔ دیکھیے انجامِ کار کیا ہوتا ہے۔ یہاں باہر سے اندر کوئی بغیر ٹکٹ کے آنے جانے نہیں پاتا۔ تم زنہار یہاں کا ارادہ نہ کرنا۔ ابھی دیکھا چاہیے، مسلمانوں کی آبادی کا حکم ہوتا ہے یا نہیں۔ بہ ہر حال، منشی صاحب کو میرا سلام کہنا اور یہ خط دکھا دینا۔ اس وقت تمھارا خط پہنچا اور اسی وقت میں نے یہ خط لکھ کر ڈاک کے ہرکارے کو دیا۔

شنبہ ۵ دسمبر ۱۸۵۷ء

(غالبؔ)

مشق

لفظ و معنی

ناگاہ	:	یک بہ یک، اچانک
اختلاط	:	میل ملاپ
انبساط	:	خوشی
بعینہٖ	:	ہو بہ ہو، بالکل
موسوم	:	نام سے پکارا جانے والا

© NCERT not to be republished

واللہ	:	خدا کی قسم
اہلِ حرفہ	:	مختلف پیشوں سے متعلق لوگ
مسکن	:	رہنے کی جگہ، گھر
صاحبانِ عالی شان	:	مراد انگریز حکّام
غارت	:	لوٹ، تباہی و بربادی
کوچہ	:	گلی
مبالغہ جاننا	:	واقعے کے خلاف سمجھنا، غلط جاننا
شدّت	:	سختی
بازپرس	:	پوچھ گچھ
ہنگام دار و گیر	:	وقت، زمانہ، پکڑ دھکڑ
ہنگامہ	:	شورش، فتنہ وفساد
خواہی	:	چاہے
آشوب	:	ہنگامہ، فتنہ وفساد
مصلحت	:	مشورہ
مخبر	:	خبر دینے والا، خفیہ رپورٹ دینے والا
سیاست پانا	:	سزا پانا
جرنیلی بندوبست	:	فوجی انتظام
ٹکٹ	:	اجازت نامہ
زنہار	:	ہرگز

© NCERT not to be republished

غور کرنے کی بات

- انگریزوں کے خلاف 1857 کی بغاوت کی ابتدا ۱۰ ارمئی کو ہوئی۔ اس ہنگامے کے زمانے میں اور اس کے ختم ہونے کے بعد، دہلی والے جن تکلیف دہ اور مایوس کن حالات سے دوچار ہوئے، غالبؔ نے اس خط میں نہایت پر اثر انداز میں ان کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس قسم کے واقعات انسان کی شخصی اور سماجی زندگی کا تانا بانا بری طرح سے بکھیر دیتے ہیں۔ اس خط سے اس کا بہ خوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔
- اس خط کو غور سے پڑھا جائے تو یہ بات بھی سمجھی جاسکتی ہے کہ غالبؔ کے خطوط صرف اُن کی ذاتی زندگی ہی کی عکاسی نہیں کرتے، ان کے زمانے کے سماجی ماحول اور سیاسی حالات کے بارے میں بھی نہایت کارآمد معلومات فراہم کرتے ہیں۔

سوالات

1. ''دوسرا جنم ہم کو ملا'' اس سے غالبؔ کی کیا مراد ہے؟
2. ''مفصّل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں'' غالبؔ نے یہ بات کیوں لکھی ہے؟
3. ''اس فتنہ وآشوب میں میں نے کسی مصلحت میں دخل نہیں دیا'' سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟
4. ''گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں'' اس کا کیا مطلب ہے؟
5. ''مجرم سیاست پاتے جاتے ہیں'' غالبؔ نے اس جملے میں کیا کہنا چاہا ہے؟

عملی کام

- اس خط کی روشنی میں غالبؔ کے زمانے پر ایک نوٹ لکھیے۔

© NCERT not to be republished

منشی نبی بخش حقیرؔ کے نام

بھائی صاحب کا عنایت نامہ پہنچا۔ آپ کا ہاتھرس سے کول آجانا ہم کو معلوم ہو گیا تھا ۔ ہمارا ایک وقائع نگار اُس ضلعے میں رہتا ہے۔ حق تعالیٰ اُس کو جیتا رکھے ۔

گرمی کا حال کیا پوچھتے ہو، اس ساٹھ برس میں یہ لؤ اور یہ دھوپ اور یہ تپش نہیں دیکھی ۔ چھٹی ساتویں رمضان کو مینہ خوب برسا۔ ایسا مینہ، جیٹھ کے مہینے میں بھی کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اب مینہ کُھل گیا ہے ۔ ابر گِھرا رہتا ہے ۔ ہوا اگر چلتی ہے تو گرم نہیں ہوتی اور اگر رُک جاتی ہے تو قیامت آتی ہے ۔ دھوپ بہت تیز ہے ۔ روزہ رکھتا ہوں مگر روزے کو بہلائے رہتا ہوں ، کبھی پانی پی لیا، کبھی حقّہ پی لیا، کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجب فہم اور طُرفہ روش رکھتے ہیں ۔ میں تو روزہ بہلاتا رہتا ہوں اور یہ صاحب فرماتے ہیں کہ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ نہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے۔

جے پور کا حال آپ کو منشی صاحب کے اظہار سے یا ان کے نام کے خطوط دیکھ کر معلوم ہو گیا ہے ۔ مکرّر کیوں لکھوں۔ خیر غنیمت ہے ۔ یہ کیا فرض تھا کہ ہم جو چاہتے تھے، وہی ہوتا۔

ہاں بھائی پرسوں کسی شخص نے مجھ سے ذکر کیا کہ ’’اردو اخبار‘‘ دہلی میں تھا کہ ہاتھرس میں بلوہ ہوا اور مجسٹریٹ زخمی ہو گیا۔ آج میں نے ایک دوست کے ہاں سے اس اخبار کا دو ورقا منگا کر دیکھا ۔ واقعی اس میں مندرج تھا کہ راہیں چوڑی کرنے پر اور حویلیاں اور دوکانیں ڈھانے پر بلوہ ہوا اور رعایا نے پتھّر مارے اور مجسٹریٹ زخمی ہوا ۔ حیران ہوں کہ اگر یوں تھا تو صاحب وہاں سے چلا کیوں نہ آیا۔ اور اگر حاکم نہیں آیا تو آپ کیوں کر تشریف لائے ۔ ہوس ناکانہ خواہش ہے کہ آپ اس حال کو مفصّل لکھیے ۔

(غالبؔ)

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی

وقائع نگار	:	واقعہ نویس، خبریں دینے والا
تپش	:	گرمی
فہم	:	سمجھ
طُرفہ	:	انوکھا
دو ورقا	:	دو ورق والا
ہوس ناکانہ	:	ہوس سے بھرا ہوا، مراد بے تابی سے

غور کرنے کی بات

- ہاتھرس کے فساد کی خبر سے غالبؔ کو جو تشویش ہوئی اس کا اظہار انھوں نے اس خط میں کیا ہے۔
- یہ فساد راستوں کو چوڑا کرنے اور حویلیوں کو ڈھانے کے سبب رونما ہوا تھا۔
- اس خط میں گرمی کے مہینے میں روزے کی کیفیات کا ذکر کیا گیا ہے۔

سوالات

1. غالبؔ نے کن لفظوں میں گرمی کی شدّت کا ذکر کیا ہے؟
2. غالبؔ کی مکتوب نویسی کی خصوصیات واضح کیجیے۔
3. ہاتھرس میں فساد کا سبب کیا تھا؟

عملی کام

- آپ پر گرمی کا موسم کیا اثر ڈالتا ہے۔ ان کیفیات کو اپنے لفظوں میں لکھیے۔

© NCERT not to be republished

تنقیدی مضمون

وہ مضمون جس میں کسی ادبی صنف، کسی ادبی تخلیق یا کسی ادبی نظریے کے مختلف پہلوؤں پر رائے زنی کی جائے تنقیدی مضمون کہلاتا ہے۔ ادب میں تنقید کا مفہوم بڑا وسیع ہے۔ اس کے تحت ادبی تخلیقات کی خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ ہر فن کے کچھ اصول ہوتے ہیں، جن کی روشنی میں فن اور ادب کی جانچ کی جاتی ہے۔ تنقید نگار کے لیے ذاتی پسند وناپسند سے زیادہ اہم وہ معیار ہوتے ہیں جن کی قدر و قیمت ہر زمانے میں برقرار رہتی ہے۔

ہم جب کسی ادبی تخلیق کو پڑھتے ہیں تو وہ ہمیں متاثر کرتی ہے۔ یہ تاثر اچھا بھی ہوسکتا ہے اور بُرا بھی۔ یہ تاثر وقتی بھی ہوسکتا ہے اور مستقل بھی۔ چوں کہ ہم میں زیادہ تر لوگ ادب کو وقت گزاری کی چیز سمجھتے ہیں اور اس سے صرف تفریح حاصل کرنا چاہتے ہیں اس لیے ہم بالعموم کسی تخلیق کو بار بار نہیں پڑھتے۔ جب کہ تنقید نگار ادبی تخلیق کا ایک سے زیادہ بار مطالعہ کرتا ہے اور ہر بار وہ ایک نئے تاثر سے دوچار ہوتا ہے۔ بہت سے تاثرات سے گزرنے کے بعد وہ اُن کی چھان پھٹک کرتا ہے۔ اس طرح اُس تخلیق کی زیادہ سے زیادہ خوبیاں اور خامیاں اُس پر واضح ہوتی جاتی ہیں۔ اِس عمل سے گزرنے کے بعد ہی تنقید نگار کسی نتیجے تک پہنچتا ہے۔ تنقید، تشریح اور تجزیہ ہی نہیں کرتی، ادبی تخلیق کے بارے میں ایک سوچی سمجھی رائے بھی دیتی ہے۔

حالی، شبلی اور محمد حسین آزاد کے دور کے بعد جن نقادوں کی تحریریں ہمارے لیے خاص اہمیت رکھتی ہیں ان میں عبدالرحمٰن بجنوری، مسعود حسن رضوی ادیب، مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین، آل احمد سرور، کلیم الدین احمد وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔

© NCERT not to be republished

احتشام حسین

1912 تا 1972

سید احتشام حسین اعظم گڑھ کے ایک گاؤں ماہل میں پیدا ہوئے۔ تعلیم اعظم گڑھ اور الہ آباد میں حاصل کی۔ 1932 کے آس پاس ان کی ادبی سرگرمیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ ابتدا میں افسانہ نگاری اور ڈرامانویسی کے ساتھ ساتھ نظمیں اور غزلیں بھی لکھتے رہے۔ بعد میں تنقید پر توجہ کی۔ 1936 میں الہ آباد یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا۔ 1938 میں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں استاد مقرر ہوئے۔ 1952 میں راک فیلر فاؤنڈیشن کی مدد سے امریکا اور انگلستان کا سفر کیا۔ 1961 میں الہ آباد یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ انتقال الہ آباد میں ہوا۔

احتشام حسین نے علم زبان سے متعلق جان بیمز کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ''ہندوستانی لسانیات کا خاکہ'' کے نام سے کیا۔ اس کے علاوہ افسانوں کا مجموعہ ''ویرانے'' اور سفرنامہ ''ساحل اور سمندر'' کے نام سے شائع ہوا۔ بچوں کے لیے ''اردو کی کہانی'' لکھی۔ ہندی میں اردو ادب کی تاریخ ''اردو ساہتیہ کا آلوچناتمک اتہاس'' کے عنوان سے مرتّب کی۔

احتشام حسین کا اصل میدان تنقید ہے۔ وہ ترقی پسند تحریک سے شروع سے وابستہ رہے۔ اشتراکیت میں یقین رکھتے تھے۔ لہٰذا اپنی تنقیدی تحریروں میں انھوں نے اسی نظریے کی روشنی میں زندگی اور ادب کے مسائل کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ تنقیدی مضامین کے متعدد مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ چند کے نام درج ذیل ہیں:

''تنقیدی جائزے''، ''روایت اور بغاوت''، ''ادب اور سماج''، ''تنقیدی اور عملی تنقید''، ''ذوقِ ادب اور شعور''، ''افکار و مسائل'' اور ''اعتبارِ نظر'' وغیرہ۔

پیشِ نظر مضمون ''اعتبارِ نظر'' سے ماخوذ ہے۔ اس میں رتن ناتھ سرشاؔر کے ناول ''فسانۂ آزاد'' کے مشہور مزاحیہ کردار ''خوجی'' کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

© NCERT not to be republished

5257CH03

خوجی — ایک مطالعہ

کبھی کبھی تو خوجی پر غور کرتے ہوئے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اسے صرف لکھنؤ کا انسان سمجھنا اس کی عظمت اور آفاقیت کی توہین ہے۔ وہ ہر ایسے عہد میں پیدا ہوتا ہے جب اس دور کی صداقت پر شک ہونے لگتا ہے۔ وہ شیکسپیر کو فالسٹاف اور کنگ لیئر کے درباری ظریف کی شکل میں ملا تھا۔ سروینٹیز نے اسے ڈان کوئکزوٹ اور سینکو پانزا کے لباس میں پایا تھا۔ سرشار نے اسے خوجی کے بھیس میں ڈھونڈ نکالا اور منشی سجاد حسین نے حاجی بغلول کہہ کر پکارا۔ وہ ہر دفعہ عاقلوں کی دنیا پر تنقید کرنے کے لیے اٹھتا ہے اور اپنی احمقانہ باتوں سے بہت سی ایسی صداقتوں کی طرف اشارہ کر دیتا ہے، سنجیدگی جس کی متحمّل نہیں ہوسکتی تھی۔ ہاں، یہ نہ بھولنا چاہیے کہ لکھنؤ اور سرشار خوجی ہی کو جنم دے سکتے تھے۔

خوجی سے ہماری پہلی ملاقات نواب صاحب کے تاریخی بٹیر صف شکن علی شاہ کے گم ہو جانے کے وقت ہوتی ہے، جہاں بہت سے مصاحب نواب صاحب کو بٹیر کی گم شدگی پر تعزیت دے رہے ہیں، وہاں خوجی بھی ہے۔ اس میں کوئی خصوصیت ایسی ضرور ہے کہ وہ بہت جلد ہمیں اپنی طرف متوجّہ کر لیتا ہے۔ اس کی تیز زبانی، اس کے فقرے، اس کی خالص افیونیوں کی سی گفتگو، سب میں ایک ذہین بھانڈ کی کیفیت ہے۔ شروع میں ایسا نہیں معلوم ہوتا کہ آگے بڑھ کر اس کی ہستی افسانے پر چھا جائے گی اور جہاں وہ نہ ہوگا، وہاں ''فسانۂ آزاد'' کی دلکشی کو گہن لگ جائے گا۔ لیکن جب نواب صاحب کی زبانی یہ معلوم ہوتا ہے کہ خوجی کی عمر ساٹھ سال ہے تو ہمیں اس کی باتوں میں ایک طرح کا مزا آنے لگتا ہے۔ وہ اپنے خیال میں سنجیدگی سے رائے دے رہا ہے لیکن ہر شخص اسے چھیڑتا ہے۔ وہ بھی خاموش نہیں رہ سکتا۔ ہر بات کا جواب دینا ضروری ہے۔ ہر جگہ اپنی برتری جتانا ضروری ہے اور ہر شخص پر تنقید کرنا لازمی ہے۔ یہیں ہمیں اس کی سیرت کے ابتدائی نقوش مل جاتے ہیں، جن کا زیادہ حصّہ کتاب کے ختم ہونے تک باقی رہتا ہے۔ اس کے ڈرنے اور نفرت کرنے کی چیزوں میں پانی ہے جس کے نام سے وہ پناہ مانگتا ہے۔ آگے چل کر اس میں کمہار اور' ازعفران کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کی پسند کی چیزیں افیون اور گنّا ہیں۔ چونکہ اس کا کردار مبالغہ آمیز اور غیر معتدل ہے اس لیے اس کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی محبت اور نفرت ہر چیز جلد جلد نمایاں ہوتی رہتی ہیں۔

خوجی اپنی عام گفتگو میں اپنا مذہب اور اپنی قومیت ہندوستانی ظاہر کرتا ہے۔ لیکن جب تہذیب کے امتحان کا وقت آتا ہے تو

© NCERT not to be republished

وہ خالص مسلمان بن جاتا ہے۔ قدیم اور جدید میں اس کے انتخاب اور اجتناب کی حدیں واضح ہوجاتی ہیں۔ وہ سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے کبابیے کے یہاں سے کباب خرید کر کھانے کو بُرا نہیں سمجھتا کیونکہ ایسا ہوتا آیا ہے لیکن ہوٹل میں جا کر کھانے کو وہ شرعاً ناجائز خیال کرتا ہے کیونکہ اسے یقین ہے کہ وہاں شراب ضرور پینا پڑتی ہے اور سؤر کے گوشت سے تو چھٹکارا ہی نہیں۔ انھیں باتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خوجی میں درحقیقت وہ طنز ہے جو ایک مٹتی ہوئی تہذیب، معاشرتی تغیرات کے خلاف اپنے آخری حربے کے طور پر استعمال کرتی ہے۔

یہ کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ آزاد اور خوجی مل کر اس وقت کی زندگی کی تصویر بناتے ہیں۔ ایک کے بغیر دوسرا ادھورا رہ جائے گا، ایک دوسرے کے لیے عقبی زمین کا کام دیتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ سرشار نے ایک ہی کردار کے دو ٹکڑے کر دیے ہیں۔ انسانی سیرت کے جن پہلوؤں میں ان کو بلندیٔ فکر اور ربط نظر آیا، وہ آزاد کے لیے مخصوص کر دیے اور جن میں پستی فکر اور بے ڈھنگا پن تھا، وہ خوجی کے سر منڈھ دیے چنانچہ دونوں کا تقابلی مطالعہ بڑی آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ اگر میاں آزاد عالم فاضل ہیں تو خوجی بھی اپنی علمیت کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ وہ آزاد کے ساتھ ساتھ فیضی کی غزلوں کے اشعار پڑھتا ہے۔ وہ طبیبوں کے لکھے ہوئے نسخے پر اعتراض کرتا ہے۔ وہ لکھا پڑھا ہے اور نظمیں لکھا کرتا ہے۔ اگرچہ اس کی یہ علمیت بھی بے سلیقگی کا شکار ہے۔ سچ یہ ہے کہ جب انسان کا علم نامکمل اور بے ترتیب ہوتا ہے تو اس میں دونوں پہلو نکلتے ہیں۔ میاں آزاد بہادر ہیں تو خوجی بھی اپنی بزدلی کو عمل کے پردوں میں چھپانے

کی کوشش میں مصروف ہے۔ عاشق مزاج دونوں ہیں اور دونوں کے عشق میں ایک عجیب طرح کی ناہمواری ہے۔ فرق صرف مذاقِ سلیم اور حسنِ انتخاب کا ہے۔ ظرافت اور بذلہ سنجی دونوں کے یہاں ہے، لیکن سطح کا فرق ہے۔ اس طرح یہ نظر آنے لگتا ہے کہ خوجی اور آزاد دونوں مل کر ایک مکمّل تصویر بناتے ہیں، علاحدہ علاحدہ ان میں سے کوئی بھی مکمّل نہیں۔ خوجی کی سیرت آزاد ہی کی صحبت میں نمایاں ہوسکتی تھی۔ دوسرے کے ساتھ اور دوسرے ماحول میں دب کر رہ جاتی۔ وہ آزاد ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ آزاد کو بگاڑ دیا جائے تو وہ خوجی بن جائے گا اور خوجی کو سنوار دیا جائے تو وہ آزاد کے قریب پہنچ سکتا ہے۔

لیکن خوجی، آزاد کا ایک بگڑا ہوا خاکہ ہونے کے باوجود، اپنی ہستی ہم سے منوالیتا ہے اور سنجیدگی کی دنیا سے باہر نکل کر ہم سے سنجیدہ تنقید کے سارے حربے چھین لیتا ہے۔ لااُبالی پن کے باوجود اس میں ایک تسلسل ہے۔ اس کی افیون کی ڈبیا، اس کے چند زبان زد فقرے، قرولی کی ہر قدم پر یاد، آزاد سے محبت، پانی سے خوف، اپنی کمزوریوں اور غلطیوں سے بے خبر ہونا، اپنے کو حسین اور خوب صورت سمجھنا، اَکڑ، غصّہ، یہ سب اور ایسی بہت سی دوسری باتیں ہندوستان اور ہندوستان کے باہر اس کے ہر عمل اور فعل سے ظاہر ہوتی ہیں۔ کوئی شخص اس سے سنجیدگی سے باتیں کرنا چاہتا ہے، وہ اپنی نفسی کجروی کی وجہ سے یہی سمجھتا ہے کہ اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔ کوئی عورت اس کا قد اور چہرہ دیکھ کر ہنستی ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ اس کی تیز نگاہ سے گھائل ہوگئی۔

خوجی میں ایک دنیا دار آدمی کا تدبّر بھی ہے۔ میاں آزاد بیمار ہوتے ہیں۔ حکیم صاحب جو انھیں دیکھنے آتے ہیں، وہ نیم حکیم ہیں۔ خوجی ایک تمدّنی مرکز سے تعلق رکھنے کی وجہ سے انھیں بھانپ لیتا ہے اور قرولی کی دھمکیوں سے انھیں بھگا کر خود نسخہ لکھتا ہے۔ سرا میں ایک قتل ہوجاتا ہے تو خوجی ہی تدبیر بتاتا ہے کہ کس طرح وہ اور اس کے ساتھی اپنی بے گناہی ثابت کرسکتے ہیں۔ اس میں اتنی سمجھ ہے کہ وہ داروغہ کی رشوت میں شریک ہوجائے اور بہروپیے کی شرارتوں کا بدلا اس کی بیوی سے لے۔

خوجی کی اکڑ جس سے اُسے کافی نقصان پہنچتا ہے، اس کے احساس برتری کی مظہر ہے۔ وہ اپنا نام کم سے کم مفتی خواجہ بدیع صاحب علیہ الرحمۃ والغفران بتاتا ہے۔ ہار جانے کے بعد ہار نہیں مانتا۔ مار کھانے کے بعد اپنی قرولی کو ضرور یاد کرتا ہے۔ اگر وہ ایسا نہ ہوتا تو ''فسانہ آزاد'' کی شکل ہی کچھ اور ہوتی۔ کیونکہ وہی ہے جو اس طویل کتاب کو خشک ہونے سے بچا لیتا ہے۔

خوجی کی وہ خصوصیت جو اُسے زوال آمادہ جاگیردارانہ تمدن کا خاص کردار بناتی ہے، اس کا جذبۂ وفاداری ہے۔ جب وہ نواب صاحب کے یہاں تھا، تو ان کا نمک خوار ہونے کی حیثیت سے ان کی محبت کا دم بھرتا تھا اور جب یہی وفاداری آزاد کی طرف منتقل ہوگئی تو وہ ان کے لیے اپنی جان کو مصیبتوں میں ڈالنے کے لیے آمادہ دکھائی دیتا ہے۔ وہ بنا ہوا درباری ظریف یا بھانڈ نہیں ہے بلکہ ایک نفسیاتی کردار ہے، جس میں سچّائی اور اپنی فطرت کے ساتھ خلوص پایا جاتا ہے۔ جب نواب صاحب کا بٹیر

© NCERT not to be republished

صف شکن علی شاہ گم ہوگیا اور اس کی تلاش میں لوگ نکل کھڑے ہوئے، اس وقت آزاد نے بھی بٹیر کوڈھونڈ نکالنے کا وعدہ کیا۔ خوجی اپنے ولیِ نعمت (نواب صاحب) کی وفاداری میں آزاد پر اعتبار نہیں کرنا چاہتا۔ شاید نواب کوجُل دے جائیں اور بٹیر کے ساتھ ساتھ ان کا غم بھی نواب کو لگ جائے۔ پھر جب آزاد کے ساتھ اس کی وفاداری اور محبت کی آزمائش کا وقت آتا ہے تو اسے آزاد ہی کی بہی خواہی سے کام ہے۔ وہ آزاد کو ایسی نصیحتیں کرتا ہے جو صرف ایک خیر خواہ ہی کرسکتا ہے۔ جیسا کہ ابھی کہا گیا، اس کی زندگی میں کسی قسم کی بناوٹ نہیں معلوم ہوتی اور اگر ہے تو اتنی گہری ہے کہ وہ اس کی فطرت کا جزو بن گئی ہے، جسے کسی وقت اُس کی ذات سے علاحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ بالکل یہی بات اس معاشرت کے لیے بھی کہی جاسکتی ہے جس سے اس کا تعلّق تھا۔ معاشرت میں یہ چیز بہت جلد نمایاں ہوجاتی ہے۔

خوجی کی تصویر ہر کردار نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق کھینچی ہے۔ اگر سب کو اکٹّھا کریں تو سرشار کی زبان میں کہہ سکتے ہیں کہ خوجی مجسّم شامت، پستہ قامت، کوتاہ گردن، تنگ پیشانی، خباثت اور شرارت کی نشانی تھا۔ سرشار نے خباثت کا لفظ کچھ زیادہ مناسب نہیں استعمال کیا ہے، کیونکہ اس کے نفس میں کینہ پروری نہیں پائی جاتی۔ ہاں، اس میں اور عیوب ضرور ہیں۔ بیچارے کی صورت ایسی ہے کہ کوئی اسے شریف نہیں سمجھتا۔ یہاں تک کہ خود اسے اپنی شرافت پر شک ہونے لگتا ہے اور وہ اپنی صورت دیکھنے کے لیے آئینہ مانگتا ہے۔ خوجی کو اپنے خاندان اور آباو اجداد کی بھی ٹھیک خبر نہیں۔ ایک جگہ پر تو اپنے دفن کی وصیت کے سلسلے میں کہتا ہے کہ میں جہاں بھی مروں، مجھے میرے والد کے پہلو میں دفن کرنا۔ لیکن پھر خیال آتا ہے کہ خدا جانے والد تھے بھی یا نہیں۔ اگر تھے تو نہ جانے کب اور کہاں مرے، کہاں دفن ہوئے، اس لیے فوراً بول اٹھتا ہے کہ جو سب سے اچھی قبر دکھائی دے، اس کے والد کی قبر تسلیم کرلی جائے اور اسی کے پہلو میں اسے دفن کردیا جائے۔ اگر اس خیال کا تجزیہ کیا جائے تو شرافت کے پرانے معیار پر طنز کے عجیب وغریب پہلو پیدا ہوتے ہیں۔ جس وقت شرافت کا معیار بدل رہا ہو، اس وقت خوجی کی زبان سے ایسے شکوک کا اظہار بہت ہی بامعنی ہے۔

مختصر یہ کہ خوجی ہندوستان میں ہو یا روس، ترکی اور پولینڈ میں، وہ اپنی خصوصیتیں اپنے ساتھ لیے پھرتا ہے۔ وہ اپنی تہذیب کا علم بردار ہے۔ اس کا لااُبالی پن اسے بَد دل ہونے سے اور اس کا یقین اسے شکست کھانے سے بچاتا ہے۔ اسے دیکھ کر ہماری نظر میں زندگی کے بڑے بڑے سوال بے معنی نظر آنے لگتے ہیں اور اس کی بے اصولی ماحول پر قبضہ جما لیتی ہے۔ اس کی بنائی ہوئی دنیا میں ہم مزے لے لے کے سیر کرسکتے ہیں اور ہمیں احساس بھی نہ ہوگا کہ ہم کس قدر غیر سنجیدہ ہوگئے ہیں۔

(احتشام حسین)

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی

عاقل	:	عقلمند
متحمّل	:	برداشت کرنے والا
صف شکن	:	صفوں کو توڑ دینے والا، بہادر
گم شدگی	:	کھو جانا
مبالغہ آمیز	:	حد سے بڑھا ہوا، غیر معمولی
غیر معتدل	:	جس میں اعتدال نہ ہو، حد سے گزر جانے والا
اجتناب	:	پرہیز
تغیّرات	:	تبدیلیاں
حربہ	:	ہتھیار
عقبی	:	پچھلا
فیضی	:	فارسی کا ایک مشہور شاعر جو مغل بادشاہ اکبر کا درباری تھا
مذاقِ سلیم	:	اچھا ذوق
حسنِ انتخاب	:	انتخاب کا سلیقہ
بذلہ سنجی	:	ظرافت، فقرے بازی
زبان زد فقرے	:	وہ فقرے جو زبان پر چڑھے ہوئے ہوں
قرولی	:	ایک قسم کا چاقو، خنجر، کٹاری
کجروی	:	ٹیڑھا پن
زوال آمادہ	:	زوال پذیر، جو پستی کی طرف جائے
نمک خوار	:	نمک کھانے والا مطلب وفادار

© NCERT not to be republished

جُل	:	دھوکا
بہی خواہی	:	بھلا چاہنا، خیر خواہی
خیر خواہ	:	بھلائی چاہنے والا
کینہ پروری	:	چھپی ہوئی دشمنی، دشمنی پالنا
عیوب	:	عیب کی جمع، برائیاں

غور کرنے کی بات

- 'خوجی' پنڈت رتن ناتھ سرشار کی داستان نما ناول فسانۂ آزاد کا مشہور کردار ہے۔
- سید احتشام حسین نے خوجی کے کردار کی اہمیت بتاتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ سرشار نے ایک ہی کردار کے دو ٹکڑے کر دیے۔ ایک حصّہ میاں آزاد کی شکل میں ظاہر ہوا اور دوسرا خوجی کی صورت میں۔
- مصنف کے مطابق خوجی لا پرواہ، مغرور اور غصّہ ور ہونے کے باوجود دوستوں کی محبت کا دم بھرنے والا، لوگوں کے کام آنے والا اور معاملات کو سمجھداری سے سلجھانے والا کردار ہے۔
- مصنف کے مطابق خوجی فسانۂ آزاد میں دل چسپی پیدا کرنے والا مسخرہ نہیں ہے بلکہ اس کا کردار لکھنؤ کی زوال پذیر معاشرت کی علامت ہے۔

سوالات

1. خوجی کا حلیہ بیان کیجیے۔
2. خوجی کو مغرور ثابت کرنے کے لیے کیا دلیلیں پیش کی گئی ہیں؟
3. خوجی کے جذبۂ وفاداری کے بارے میں مصنف کی کیا رائے ہے؟
4. خوجی اور آزاد کے کرداروں میں کیا مطابقت ہے؟

عملی کام

- اپنے استاد کی مدد سے فسانۂ آزاد کا وہ حصّہ پڑھیے جس میں سرشار نے خوجی کا تعارف کرایا ہے۔

© NCERT not to be republished

خورشید الاسلام

1919 تا 2006

خورشیدالاسلام مغربی اتر پردیش کے ایک گاؤں ''اُمری'' میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دہلی کے فتح پوری اسکول میں حاصل کی۔1945 میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ایم۔اے کیا۔اسی سال یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لکچرر مُقرّر ہوئے۔1973 میں پروفیسر بنائے گئے۔صدر، شعبۂ اردو کے منصب پر فائز ہوئے۔1979 میں ملازمت سے سبک دوش ہوئے۔ درمیان میں ''لندن اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز'' سے بھی بحیثیت استاد وابستہ رہے۔علی گڑھ میں وفات پائی۔

خورشید الاسلام میں ذہانت کے آثار بچپن سے نمایاں تھے۔ وہ ایک اچھے مقرر، صاحبِ طرز نثر نگار اور خوش فکر شاعر تھے۔ ان کے تین شعری مجموعے ''رگِ جاں''، ''شاخِ نہالِ غم'' اور ''جستہ جستہ'' (نثری نظمیں) شائع ہوچکے ہیں۔

نثری تصانیف میں ''غالب۔ ابتدائی کلام'' اور مضامین کا مجموعہ ''تنقیدیں'' اہم ہیں۔ رالف رسل کے ساتھ مل کر انگریزی میں ان کی دو کتابیں ''تھری مغل پوئٹس'' اور ''غالب۔ لائف اینڈ لیٹرس'' شائع ہوئی ہیں۔اس کے علاوہ انھوں نے قائمؔ اور سوداؔ کے انتخابات بھی مرتّب کیے ہیں۔

خورشید الاسلام بہت شگفتہ اور تخلیقی انداز کی نثر لکھتے تھے۔ ان کے تنقیدی مضامین میں بھی شگفتگی کا یہ انداز قائم ہے۔ پیشِ نظر مضمون میں مرزا ہادی رسواؔ کے مشہور ناول ''امراؤجان اداؔ'' پر ایک نئے زاویے سے نگاہ ڈالی گئی ہے۔ یہ ان کے نثری اسلوب کی بھی ایک اچھی مثال ہے۔

© NCERT not to be republished

امراؤ جان ادا

ہماری زبان میں ایک ناول ایسا بھی ہے، جسے خاصے کی چیز سمجھا جاتا ہے، لیکن جس کی طرف ابھی تک کوئی توجّہ نہیں کی گئی۔

غالباً اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اسے محض ایک طوائف کی دلچسپ کہانی سمجھ کر پڑھا جاتا رہا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے بنیادی اور قابلِ قدر پہلو نظر سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ''امراؤ جان'' ناول میں ایک اہم کردار کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہی اس ناول کا موضوع بھی ہو۔ ناول کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے ضروری

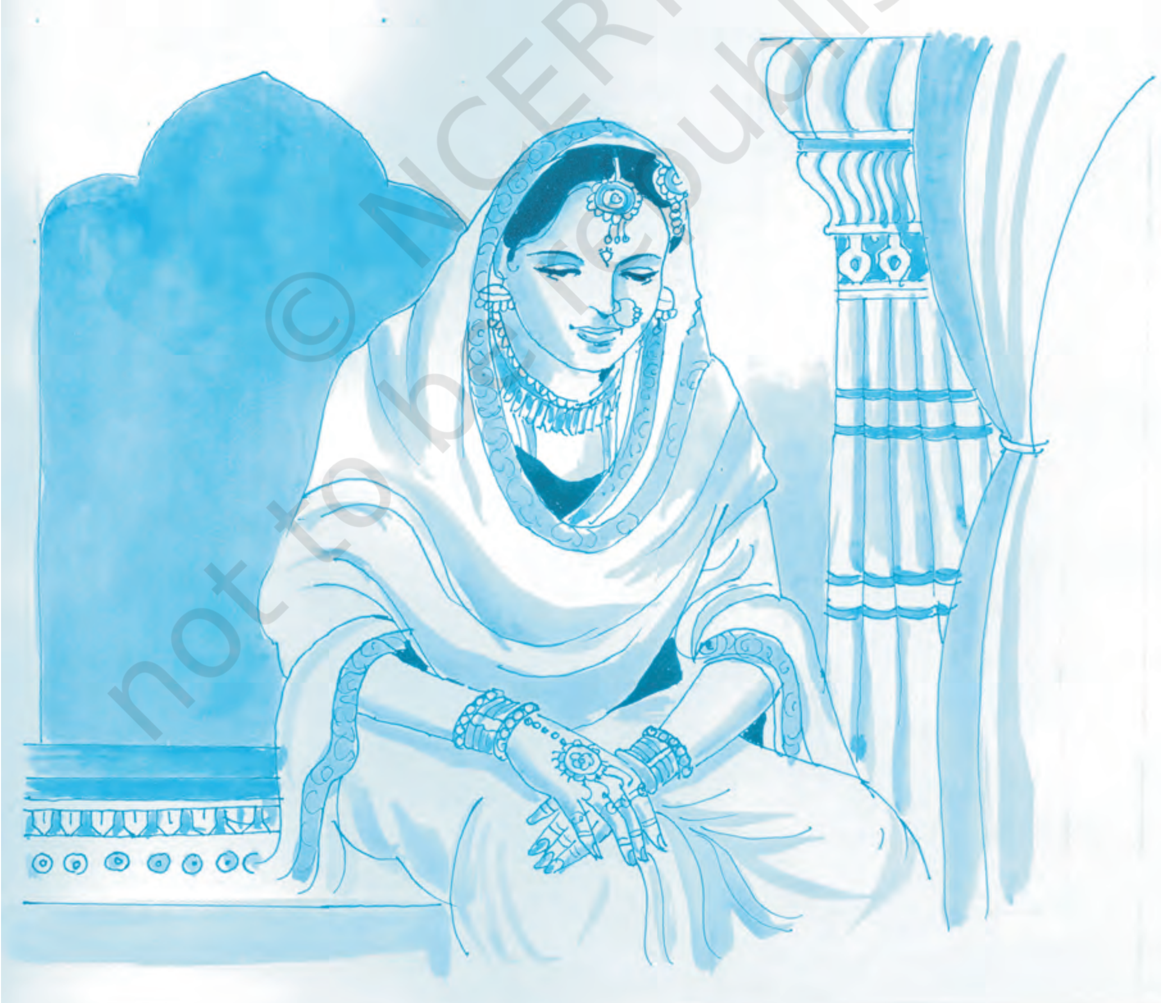

© NCERT not to be republished

ہے کہ پہلے اُس کے موضوع کو دریافت کیا جائے، یہ اس لیے کہ ہر موضوع چند مخصوص امکانات رکھتا ہے اور اس کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ ناول نگار کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ ان امکانات کو بروے کار لائے، ان تقاضوں کو پورا کرے اور فطرت کی ان لہروں کو بہتا ہوا دکھائے جو واقعات اور کرداروں کی ساخت پرداخت کرتی ہیں۔ موضوع سے واقفیت حاصل کرنے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ ہم فن کے مطالبوں کو پا گئے ہیں اور ان کی کسوٹی پر تفصیل، تصادم اور ترجمانی کے عمل کو پرکھ سکتے ہیں، لہٰذا ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ اس ناول کا موضوع کیا ہے؟

رسواؔ ابتدا ہی میں ہمارا تعارف امراؤ جان سے اس طرح کراتے ہیں:

''اسی کمرے کے برابر ایک کمرہ تھا۔ اس میں ایک طوائف رہتی تھی۔ بود و باش کا طریقہ اور رنڈیوں سے بالکل علیحدہ تھا نہ کمرہ پر کسی نے سرِ راہ بیٹھے دیکھا نہ وہاں کسی کی آمد و رفت تھی۔ دروازوں پر دن رات پردے پڑے رہتے تھے۔ چوک کی طرف نکاس کا راستہ بالکل مقفّل رہتا تھا۔ گلی کی جانب ایک اور دروازہ تھا۔ اسی سے نوکر چاکر آتے جاتے تھے۔ اگر کبھی کبھی رات کو گانے کی آواز نہ آیا کرتی تو یہ بھی نہ معلوم ہوتا کہ اس کمرے میں کوئی رہتا بھی ہے یا نہیں۔ جس کمرے میں ہم لوگوں کی نشست تھی۔ اس میں ایک چھوٹی سی کھڑکی لگی تھی۔ مگر اس میں کپڑا پڑا ہوا تھا ... اتنے میں میں نے ایک شعر پڑھا۔ اس کھڑکی کی طرف سے واہ کی آواز آئی۔ میں چپ ہو گیا ... منشی محمد حسین نے پکار کر کہا: ''غائبانہ تعارف ٹھیک نہیں''۔ ...

ابھی قصّہ شروع نہیں ہوا ہے، نہ مرزا نے مشاعرے کی محفل جمائی ہے۔ ہم امراؤ جان کے ہمسائے میں لے جائے گئے ہیں۔ اتنے میں رسواؔ ہمیں پاس آنے کا اشارہ کرتے ہیں۔ ہم رسوا کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر دراز سے جھانکتے ہیں اور ہمیں امراؤ جان کے بارے میں چند ضروری باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔

اس کے بعد امراؤ جان مشاعرے میں آتی ہیں یا ترغیب دے کر لائی جاتی ہیں اور اپنی غزل پیش کرتی ہیں۔

منشی صاحب : اچھا وہ مطلع کیا تھا؟

امراؤ جان : میں عرض کیے دیتی ہوں ؎

کعبے میں جا کے بھول گیا راہ دَیر کی
ایمان بچ گیا مرے مولا نے خیر کی

منشی صاحب : خوب کہا ہے!

خان صاحب : اچھا مطلع کہا ہے۔ مگر یہ ''بھول گیا'' کیوں؟

امراؤ جان : تو خان صاحب! کیا میں ریختی کہتی ہوں؟

اب وہ عبارت دیکھیے جہاں اصل قصّے کا آغاز ہوتا ہے۔

''ہاں اتنا جانتی ہوں کہ فیض آباد میں شہر کے کنارے کسی محلّے میں میرا گھر تھا۔ میرا مکان پختہ تھا۔ آس پاس کچھ کچّے مکان۔ کچھ جھونپڑے، کچھ کھپریلیں، رہنے والے بھی ایسے ہی ویسے لوگ ہوں گے۔ میرے ابّا، بہو بیگم صاحب کے مقبرے پر نوکر تھے ... ابّا جب شام کو نوکری پر سے آتے تھے، اس وقت کی خوشی ہم بھائی بہنوں کی کچھ نہ پوچھیے۔ میں کمر سے لپٹ گئی۔ بھائی ابّا ابّا کرکے دوڑا، دامن میں چھُپ گیا۔ ابّا کی باچھیں مارے خوشی کے کھلی جاتی ہیں.......... دلاور خاں کا مکان ہمارے مکان سے تھوڑی دور پر تھا۔ مُوا ڈکیتوں سے ملا ہوا تھا.......... ابّا سے سخت عداوت تھی۔''

ان اقتباسات سے ہمیں امراؤ جان کے آغاز اور انجام دونوں سے متعلق چند ضروری خبریں مل جاتی ہیں۔ پیدائش کے بعد اور موت سے پہلے وہ کیا ہے؟ کس ماحول میں اس نے اپنی آنکھیں کھولیں؟ اور اب کس منزل پر آن کر ٹھہر گئی ہے۔ یہی نہیں، بلکہ ہمیں خفیف سا اندازہ ان بھول بھلیّوں کا بھی ہو جاتا ہے۔ جن سے امراؤ جان کو گزرنا پڑا ہوگا اور ان چھوٹی چھوٹی نرم گرم کہانیوں کا بھی جن کا تانا بانا ایک خوش مذاق طوائف کے گرد بُنا جا سکتا ہے۔ گویا مرزا صاحب قصّے کے ترتیبی منظر اور اس کی تمہید ہی میں ہمیں اُمراؤ جان اداؔ سے اس طرح متعارف کرا دیتے ہیں کہ اس کی زندگی میں کوئی راز باقی نہیں رہتا۔ نہ ہمارے دل و دماغ میں تجسّس کی کوئی اونچی لہر اٹھتی ہے اور نہ ہمیں اس بات کی توقع ہوتی ہے کہ آئندہ چل کر اس کی زندگی میں کچھ ایسے انکشافات آئیں گے جو ہماری تسکین کا باعث اور تحیّر کا سامان ہوں گے۔ اوپر دیے ہوئے اقتباسات کی مدد سے ہم کتنی منزلیں طے کر جاتے ہیں۔ امراؤ جان ایک طوائف تھی، اب تائب ہو چکی ہے، شعر و سخن کا ذوق رکھتی ہے۔ ادب کے چند اصناف سے واقف ہے۔ خود شاعر ہے۔ بچپن ایک شریف متوسّط گھرانے میں گزرا۔ یہاں اس کا نام امراؤ جان نہیں کچھ اور ہوگا۔ دلاور خاں کی اس کے باپ سے دشمنی تھی۔ اسی نے اس معصوم کو گھر کی چار دیواری سے نکال کر ایک ایسی دنیا میں پھینک دیا، جہاں دوزخ مہکتے ہیں اور فردوس خاموش ہیں۔

اس خاکے پر ہماری آنکھیں جم نہیں جاتیں اور ہم اس کی تہوں کو کھولنے اور اس کے بھیدوں کو ٹٹولنے کے بجائے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔

مگر اس سے پہلے کہ ہم نگاہ کے دامن کو دور تک پھیلائیں، یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک مقام اور دیکھتے چلیں۔ البتّہ

© NCERT not to be republished

اس کے لیے جست لگانا ضروری ہے۔ یہ وہ جگہ ہے، جہاں کہانی تین چوتھائی ہو چکی ہے۔ امراؤ فیض آباد میں ہے۔صدیوں بعد زمانے نے ایک ایسی کروٹ لی ہے کہ سخت وسست ہموار ہو گئے ہیں۔غدر کی آگ دب چکی ہے مگر کہیں کہیں چنگاریاں اٹھتی دکھائی دیتی ہیں۔امراؤ جان زندگی کی گردان کیے جا رہی ہے۔اپنے وطن میں ہے،مگر سب کے لیے بیگانہ ہے۔

(خورشید الاسلام)

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی

دریافت کرنا	:	معلوم کرنا، پوچھنا
امکانات	:	امکان کی جمع، گنجائش
تصادم	:	ٹکراؤ
بود و باش	:	رہن سہن
مُقفّل	:	جس پر تالا لگا ہو، بند
ترغیب	:	رغبت دلانا، مائل کرنا
ریختی	:	اردو شاعری کی ایک صنف جس میں عورتوں کی طرف سے انھیں کی مخصوص زبان میں ان کے جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے
انکشافات	:	انکشاف کی جمع، نئی نئی باتوں کا معلوم ہونا یا کرنا
تحیّر	:	حیرت
تائب	:	توبہ کرنے والا

غور کرنے کی بات

- یہ مضمون مرزا محمد ہادی رسوا کے مشہور ناول 'امراؤ جان آدا' کے بارے میں ہے۔
- خورشید الاسلام نے اس مضمون کے اقتباسات بھی پیش کیے ہیں۔ اس سے تنقیدی مضمون میں استدلال کا رنگ پیدا ہوجاتا ہے۔
- 'خاصے کی چیز سمجھا جانا' کا مطلب ہے پسند کیا جانا 'بروے کار لانا' کا مطلب ہے استعمال کرنا 'ساخت پرداخت کرنے' کا مطلب ہے بنانا اور پروان چڑھانا اور 'فن کے مطالبوں کو پا جانے' کا مطلب ہے فن کی ضرورت کا پورا ہوجانا۔ ان مثالوں سے واضح ہوتا ہے کہ مصنف نے روزمرہ زبان اور محاورے کے استعمال سے زبان کو دل چسپ بنا دیا ہے۔

سوالات

1. امراؤ جان آدا کے کردار پر روشنی ڈالیے۔
2. خورشید الاسلام نے ناول نگار کی کن ذمّے داریوں کو بیان کیا ہے؟
3. خورشید الاسلام نے امراؤ جان آدا کا ایک اقتباس پیش کر کے یہ وضاحت کی ہے کہ ہم اسے پڑھ کر امراؤ جان کے آغاز اور انجام دونوں سے واقف ہوجاتے ہیں۔ آپ کے خیال میں کیا یہ بات صحیح ہے؟ لکھیے۔

عملی کام

- اگر آپ کے اسکول کی لائبریری میں رسوا کا ناول ''امراؤ جان آدا'' موجود ہو تو اس کا کوئی حصہ پڑھیے۔
- اس مضمون میں شامل محاوروں کی فہرست بنائیے۔
- 'جہاں دوزخ مہکتے ہیں اور فردوس خاموش ہیں' کا مطلب اپنے استاد سے دریافت کر کے لکھیے۔

© NCERT not to be republished

مختصر افسانہ

مختصر افسانہ جدید دور کی اہم نثری صنف ہے۔اس کے ذریعے کسی شخص کی زندگی کے ایک پہلو یا کسی واقعہ کا بیان اس طرح کیا جاتا ہے کہ پڑھنے والے کے دل ودماغ پر اُس کا گہرا اثر پڑے۔

افسانے کی متعدد تعریفیں کی گئی ہیں۔ایک ممتاز مغربی ادیب کا کہنا ہے کہ افسانہ ایسی نثری کہانی ہے جو ایک ہی نشست میں پڑھی جاسکے۔ افسانہ سیدھی سادی کہانی نہیں بلکہ ایسی فنی تخلیق ہے جس میں فن کار کے ارادے اور حکمت کا بھی دخل ہوتا ہے۔کسی مخصوص واقعے یا صورتِ حال یا کسی مخصوص کردار کا نقش اِس طرح ابھارا جاتا ہے کہ پلاٹ یعنی واقعات کی ترتیب و تنظیم پڑھنے والے کو متاثر کر سکے۔

افسانے کے ماہروں نے اس کی جو تعریفیں بیان کی ہیں اُن سے واضح ہوتا ہے کہ افسانہ بیانیہ تخلیقی تحریر ہے۔افسانے میں کسی ایک کردار یا کرداروں کے ایک مخصوص گروہ کے نقوش یا ذہنی کشمکش کو نمایاں کیا جاتا ہے۔افسانے میں واقعات کی تفصیل، کرداروں کی گفتگو اور منظر و ماحول کی پیشکش بہت نپی تلی ہوتی ہے۔

ہر افسانے کے لیے پلاٹ، کردار اور زمان ومکاں لازمی اجزا کی حیثیت رکھتے ہیں۔اسی لحاظ سے افسانے کی اقسام بھی بیان کی گئی ہیں یعنی پلاٹ کا افسانہ، کردار کا افسانہ یا معاشرتی افسانہ۔

افسانے کی کامیابی کے لیے کچھ ناقدین، افسانہ نگار کے نقطۂ نظر کو اہم قرار دیتے ہیں۔افسانہ نگار کے اسلوب میں رمز، کنایے اور تاثیر کو بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔

اردو میں مختصر افسانے کا آغاز بیسویں صدی کے ساتھ ہوا۔سب سے پہلے پریم چند اور سجّاد حیدر یلدرم کے افسانے سامنے آئے۔ان کے فوراً بعد کئی افسانہ نگار ابھرے: مثال کے طور پر ل۔احمد اکبرآبادی، سلطان حیدر جوش، نیاز فتح پوری، حجاب امتیاز علی وغیرہ۔

1936 میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔اس سے چند برس پہلے ''انگارے'' کے نام سے باغیانہ کہانیوں کا ایک مجموعہ شائع ہو چکا تھا۔ان کہانیوں نے موضوع اور فن دونوں اعتبار سے نئے تجربوں کی بنیاد ڈالی۔اس کے بہت پہلے پریم چند

© NCERT not to be republished

(1880 تا 1936) نے اردو، افسانہ نگاری کو عروج پر پہنچا دیا تھا۔ پریم چند نے حقیقت نگاری اور نفسیاتی کردار نگاری کے ساتھ مشرقی یو پی کی دیہی زندگی اور قومی زندگی کے مسائل کی ترجمانی کی۔ اس کے بعد سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، غلام عبّاس، حیات اللہ انصاری، احمد ندیم قاسمی اور بلونت سنگھ کے ہاتھوں اردو افسانے نے بہت ترقی کی۔

آزادی کے بعد اُبھرنے والے افسانہ نگاروں میں قرۃ العین حیدر نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ 1960 کے لگ بھگ اردو میں علامتی افسانے کا آغاز ہوا۔ اس رنگ کے نمائندہ افسانہ نگار انتظار حسین، سریندر پرکاش، انور سجّاد، بلراج مین را، نیّر مسعود اور خالدہ حسین ہیں۔ حقیقت نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے والوں میں حیات اللہ انصاری، خواجہ احمد عبّاس، احمد ندیم قاسمی، شوکت صدیقی، اشفاق احمد، رام لعل، جوگندر پال قابل ذکر ہیں۔ نئی نسل کے کئی افسانہ نگاروں نے براہ راست طرز بیان کے بجائے علامتی طرزِ بیان کو ترجیح دی ہے۔

© NCERT not to be republished

بلونت سنگھ

1920/21 تا 1986

بلونت سنگھ ضلع گجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گاؤں کے اسکول میں ہوئی۔ میٹرک دہرہ دون کے کیمبرج اسکول سے پاس کیا۔ کرسچین کالج الہ آباد سے انٹر اور الہ آباد یونیورسٹی سے بی۔اے کرنے کے بعد معاش کی تلاش میں لاہور اور کراچی بھی گئے۔ دہلی میں رسالہ ''آج کل'' کے نائب مدیر کی خدمات بھی انجام دیں۔ اس کے بعد سے اپنے انتقال تک الہ آباد میں رہے۔ انھوں نے الہ آباد سے اردو میں رسالہ ''فسانہ'' اور ہندی میں ''اردو ساہتیہ'' جاری کیا جس میں اردو تخلیقات، ناگری رسم الخط میں شائع ہوتی تھیں۔

بلونت سنگھ نے کئی طویل اور مختصر ناول لکھے۔ ''رات چور اور چاند'' اور ''چک پیراں کا جسّا'' پہلے اردو میں شائع ہوئے۔ ان کے ناگری رسم الخط میں شائع ہونے والے ناولوں اور افسانوی مجموعوں کی تعداد لگ بھگ تیس ہے۔

ان کا پہلا افسانہ ''سزا'' 1937 میں دہلی کے رسالے ''ساقی'' میں شائع ہوا۔ ''جگّا''، ''تار و پود''، ''ہندوستان ہمارا''، ''پہلا پتھر''، ''بلونت سنگھ کے افسانے'' اور ''سنہرا دیس'' ان کے اہم افسانوی مجموعے ہیں۔

بلونت سنگھ کے ابتدائی افسانوں میں پنجاب کی دیہی زندگی کا بہت جیتا جاگتا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ اسی بنا پر کچھ لوگوں نے فرض کرلیا کہ بلونت سنگھ صرف پنجاب کے دیہات اور سکھ کرداروں کی زندگی کے عکاس ہیں، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ان کا افسانوی کینوس خاصا وسیع ہے۔

© NCERT not to be republished

5257CH05

لمحے

سوم کا دن تھا۔

یوں تو میں اپنے دوستوں کی بہت قدر کرتا ہوں لیکن کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ دوستوں کی صورت تک نہ دکھائی دے اور میں محض اپنے لیے ہی ہوکر رہ جاؤں۔ میرے دوستوں کی تعداد بہت کم ہے اس لیے مجھے ایسے دن بھی میسر آجاتے ہیں۔

جس روز کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ وہ اسی قسم کا دن تھا، صبح کا وقت تھا، پیشتر اس کے کہ کوئی دوست میرے مکان پر پہنچ کر ''اُما کانت! اُما کانت!!'' کے نعرے لگاتا میں چائے سے فارغ ہوکر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

نہ بیوی، نہ بچے، نہ ملازمت، نہ کاروبار، نہ خوشی نہ غمی، عجب ویران کیفیت میں زندگی بسر ہو رہی تھی۔ میری بیکاری سے گھر والوں کی ناخوشی کے باعث، دل پر اداسی چھائی رہتی تھی۔ کوئی ذمہ داری نہ ہونے کی وجہ سے دماغ ہلکا رہتا تھا۔ اپنی بیوی نہ ہونے کے سبب سے، ذہن پر رومانیت کا تسلّط تھا۔

بس اسٹینڈ پر پہنچ کر دیکھا کہ کناٹ پلیس جانے کے لیے بس تیار کھڑی ہے۔ اندر اِکّا دُکّا مسافر بیٹھے ہیں، کوٹ کے کالر درست کرتا ہوا بس کے اندر داخل ہوگیا۔

آٹھ بجے تھے۔ بھلا سردی کے موسم میں کسی کو کیا پڑی تھی کہ گھر کی گرم فضا سے نکل کر باہر کو اٹھ بھاگے۔ چنانچہ بس میں ایک عجیب سکون طاری تھا۔ چند لوگ ایک دوسرے سے پرے پرے بیٹھے دھیرے دھیرے باتیں کرنے میں محو تھے۔

میں نے پہلے عورتوں اور لڑکیوں کا جائزہ لیا۔ تین لڑکیاں تھیں اور دو عورتیں۔ لڑکیاں گوری تھیں، دو دو چوٹیاں، آنکھیں بڑی نہ چھوٹی، باتیں میٹھی نہ پھیکی۔ دوسری عورت کی جانب دیکھا۔ ہرے رام! وہ تو صورت سے بالکل آیا لگی۔ شاید سچ مچ کی آیا ہو۔ خیر اب ایک عورت کا جائزہ لینا باقی تھا۔ وہ میری جانب پیٹھ موڑے بیٹھی تھی۔ اس کے کندھے پر ننھے بچے کا سر ٹِکا تھا اور ایک بچّی سامنے کی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ گویا وہ کم از کم دو بچّوں کی ماں تھی۔

دل پر مایوسی کا جذبہ طاری ہونے لگا۔ بیس پچیس منٹ کا یہ سفر یونہی کٹ جائے گا۔ دل بہلاوے کی کوئی حسین صورت

© NCERT not to be republished

دکھائی نہ دے گی۔ کیا یہ سفر جماہیاں لیتے ہی بِتانا پڑے گا۔

سوچا— اگر دو بچّوں کی ماں بدصورت ہے تو اپنی بہنوں سے بڑھ کر کیا ہوگی۔ یہی ناکہ ان کے برابر ہوگی یا ذرا بہتر۔ آخر یہی طے پایا کہ اُس خاتون کے عین پیچھے والی سیٹ پر ڈیرا جمایا جائے۔

پچھلی سیٹ پر چپکے سے بیٹھ کر میں نے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بالوں کی تہہ جمائی اور پھر انتظار کرنے لگا کہ وہ ذرا اِدھر اُدھر گھوم کر دیکھے تو صورت کا جائزہ لیا جائے۔

لیکن وہ اِدھر اُدھر دیکھے بغیر سامنے کی جانب منہ کیے چپکی بیٹھی رہی۔ یہاں تک کہ بس چل دی۔

مجھے بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ بارے کنڈکٹر نے آکر دام طلب کیے۔ ٹکٹ لیتے وقت خیال آیا کہ کاش اُس خاتون سے تھوڑی بہت بات چیت ہوچکی ہوتی تو اُس کے ٹکٹوں کے دام دے کر اچھے خاصے مراسم پیدا کیے جاسکتے تھے۔ جب اس کی باری آئی

تو اس نے منہ پھیر کر دیکھا۔ رخِ روشن کا جلوہ دکھائی دیا دل دھک سے رہ گیا۔

وہ واقعی بہت حسین تھی۔ تارا سی آنکھیں، نازک لب، اور درخشاں پیشانی— خلافِ امید اُس عورت کو حسین پا کر ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

اب مسئلہ یہ درپیش تھا کہ اس سے گفتگو کیوں کر شروع کی جائے۔ کون سا موضوع مناسب رہے گا۔ موسم؟......لیکن ہندوستان میں ابھی موسم کے موضوع پر گفتگو کا آغاز کرنا خاطر خواہ نتائج پیدا نہیں کر سکتا۔ اس عورت سے یہ کہنا کہ آہا! کیا ہی خوشگوار موسم ہے محض بیکار ہوگا۔ سینما، ایکٹر، ایکٹریس، بسیں، سڑکیں......نہیں، نہیں، یہ باتیں مہمل ہیں......اتنے میں عورت کے شانے کے ساتھ لگے ہوئے ننھے بچّے نے آنکھیں کھولیں اور حیرت واستعجاب سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ بڑا پیارا بچہ تھا۔ میں نے اس کے گال پر ہلکی سی چٹکی لی تو اس کے چھوٹے چھوٹے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ پھر میں نے دونوں انگلیوں سے اس کی ٹھڈّی کو ہلکے ہلکے سہلانا شروع کیا تو وہ ہنسنے لگا— میں جانتا تھا کہ اس کی ماں کو اس بات کا علم ہو چکا ہے۔

بچے کے کانوں کے پیچھے داد کے نشان دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے جرأت سے کام لے کر پوچھا۔

’’کیوں جی! ننھے کے کانوں کے پیچھے داد ہو رہا ہے......‘‘

’’جی— ہاں......‘‘

’’تو کیا آپ اس کا علاج نہیں کرائیں گی؟

’’علاج تو ہو رہا ہے......‘‘

’’کیا ہومیوپیتھی علاج کرا رہی ہیں؟‘‘

’’جی نہیں، ہے تو ایلوپیتھی......‘‘

’’ایک ڈاکٹر ہیں، رُچی رام۔ ہومیوپیتھی علاج کرتے ہیں۔ خصوصاً بچوں کے علاج میں تو اُنھیں مہارت حاصل ہے۔ اگر یہ علاج موثر ثابت نہ ہوا، تو اُن سے رجوع کیجیے گا۔‘‘

’’بہتر۔‘‘

’’بہت ہی پیارا بچّہ ہے۔‘‘ میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

عورت نے بچّے کو شانے سے ہٹا کر کھڑکی کے ساتھ پیٹھ لگا لی۔ اب اُس کا رُخ قریب قریب میری جانب تھا۔ اس نے بچّے کو زانو پر بٹھا کر دیکھنا شروع کیا وہ واقعی حسین ہے یا نہیں۔ پھر جیسے دل ہی دل میں اُس نے میرے قول کی تائید کرتے ہوئے میٹھی

© NCERT not to be republished

نظروں سے میری جانب دیکھا۔

''آپ کو بچّوں سے خاصا لگاؤ ہے۔کیا آپ کے بھی بچّے ہیں؟''

''جی نہیں۔'' میں نے قدرے جھینپ کر کہا۔''ابھی تو میری شادی بھی نہیں ہوئی۔''

''کیوں شادی نہ ہونے کی کیا وجہ ہے؟''

''یونہی۔'' میں نے سر کھجاتے ہوئے جواب دیا۔''یہی، ابھی بے کار ہوں۔جب تک آمدنی کی معقول صورت نہ ہو، دل میں شادی کا خیال بھی نہیں آ سکتا۔''

''لیکن آپ بیکار کیوں ہیں؟''

میں اس جرح سے گھبرا گیا تھا۔''میں نے پنجاب یونیورسٹی سے بی۔اے کرنے کے بعد پشاور میں کاروبار شروع کیا تھا۔آمدنی کی صورت نظر آنے لگی تو فساد شروع ہو گئے اور مجھے اِدھر بھاگنا پڑا......اب نئے سرے سے کام کرنے کا خیال ہے۔''

عورت کی آنکھوں میں اُداسی کی جھلک دکھائی دی۔اُس وقت وہ کچھ کھوئی سی نظر آ رہی تھی۔موقعے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اُس کے حسین چہرے کے خدوخال کا بغور جائزہ لینے لگا......کیا وہ میری خاطر اُداس تھی؟ ایک لمحے کے لیے ہی سہی!—— کاش! مجھے بھی ایسی ہی موہنی بیوی مل جائے۔

کہتے ہیں کہ عورت مرد کے دلی جذبات کو بہت جلد پہچان لیتی ہے۔عورت نے نظریں جھکالیں اور پھر قدرے تامّل کے بعد نہ معلوم کیوں—— بڑی بچّی کی جانب اشارہ کر کے مسکرا کر بولی۔''یہ میری بیٹی ہے۔''

''آؤ بیٹی! میرے قریب آؤ......'' میں نے ہاتھ پھیلائے۔وہ مارے شرم کے آگے نہیں بڑھی تو میں نے خود ہی بڑھ کر اسے گود میں بٹھا لیا۔''آہاہا...... بڑی اچھی ہے ہماری بے بی......اچھا تو تم پڑھتی ہو کیا؟''

لیکن وہ بڑے اہتمام کے ساتھ شرماتی رہی۔

عورت بولی''بتاؤ نا بے بی! تم سے کئے مرتبہ کہا ہے کہ یونہی مت شرمایا کرو۔''

میں نے سوچا۔کس قدر مہذب ہے یہ عورت۔اس کی بات چیت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ پڑھی لکھی اور خاصی سلجھی ہوئی ہے۔ ماں کے سرزنش کرنے پر بیٹی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کیا پڑھا ہے بھئی ہمیں بھی سناؤ......تم تو بہت اچھی بے بی ہو۔تمھیں تو پڑھا لکھا یاد ہوگا سارا، بولو یاد ہے؟''

''ہاں جی۔'' بے بی نے بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر بھرپور نظروں سے میری جانب دیکھا۔معلوم ہوتا تھا کہ اس بات کا اقبال

کرنے میں اسے بہت فخر محسوس ہورہا ہے۔کیا پڑھا ہے تم نے؟

''اے بی، سی، وائی، زیڈ۔''

اس پر ہم دونوں قہقہہ مار کر ہنسے۔میں اور وہ عورت۔ہم دونوں جو ایک دوسرے سے بہت دور تھے۔لیکن قہقہوں کی ملی جلی آواز سے یوں محسوس ہونے لگا جیسے کسی فلم کے ہیرو اور ہیروئین کوئی سحر انگیز ڈویٹ گا رہے ہوں۔

عورت نے بمشکل ہنسی روکتے ہوئے کہا۔''اری بے بی! تجھے اے، بی، سی، ابھی تک یاد نہیں ہوئی۔سی کے بعد ایک دم وائی زیڈ؟''

اب ہماری ملاقات قابلِ اطمینان درجے تک آن پہنچی تھی۔اب بیشتر خدشات دور ہو چکے تھے۔ہم دو بہت اچھے واقف کاروں بلکہ دوستوں کی طرح گفتگو کرنے لگے۔

بیس یا پچیس منٹ کے سفر میں زیادہ باتیں نہیں ہوسکتی تھیں، لیکن اگر احساسات کو لیجیے تو لمحہ بھر میں کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ایک میٹھی نظر تھی کہ زندگی کے ان لمحوں کو رنگین بناتی چلی گئی۔اس کی آواز میں ایسا لوچ اور رسیلا پن تھا کہ مدّتوں کانوں میں شہد سا گھلتا رہا۔

اِدھر اُدھر کی باتوں میں ہم اس قدر محو تھے کہ اردگرد کی کچھ خبر نہیں رہی تھی——جب میں نے جنگل میں شیر کے فرضی شکار کی کہانی سنائی اور میں نے شیر کے سامنے کھڑے ہوکر اس پر گولی چلائی تھی تو عورت کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔حیرت سے بولی۔

''لیکن میں نے تو سنا ہے کہ شیر کا شکار مچان پر بیٹھ کر کیا جاتا ہے۔''

''جی ہاں۔'' میں نے بے پروائی سے جواب دیا''لیکن کہنہ مشق شکاری مچان پر کبھی نہیں بیٹھتے ہیں۔'' وہ سچ مچ میری بات پر ایمان لے آئی۔باتوں باتوں میں مجھے خیال آیا کہ مرد کے دل میں عورت کی کشش کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عورت کے سامنے وہ دل کھول کر جھوٹ بول سکتا ہے۔

عورت طفلانہ انداز سے کئی باتیں پوچھتی رہی اور میں بڑی توجہ سے ان کے جواب دیتا رہا۔بس کی منزل قریب آ رہی تھی۔

بے بی ابھی تک میری گود میں بیٹھی تھی۔دفعتاً مجھے محسوس ہوا کہ کام نکل جانے کے بعد بے بی کو تو میں بھول ہی گیا تھا۔میں نے مجوب ہوکر بے بی کی بغلوں کو گدگدایا''ارے بے بی! تم تو کوئی بات ہی نہیں کرتیں—— کیا تم ہم سے خفا ہو؟''

وہ چپ رہی۔

''بولو——بے بی۔''

''لا ہیں۔'' بے بی نے انکار کے طور پر سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

''اچھا تو بتاؤ تمھارا نام کیا ہے؟''

''میرا لام؟''

''ہاں۔''

''سول تاناں۔''

''سلطانہ۔'' عورت نے کہا۔

مجھے پہلی مرتبہ اس بات کا علم ہوا کہ وہ مسلمان ہیں۔ سلطانہ کی بغلوں کو گدگداتے ہوئے میرے ہاتھ رُک گئے۔ میں نے قدرے ہچکچاتے ہوئے دریافت کیا۔

''کیا آپ مسلمان ہیں؟''

''جی۔'' یہ کہہ کر عورت نے میری طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

''نہیں کچھ نہیں۔'' میں ہنس دیا ــــــ ''مجھے محسوس نہیں ہوا کیونکہ بظاہر......''

پھر قدرے بھدّی سی خاموشی طاری ہوگئی۔

بات کچھ بھی نہیں تھی ــــــ میں نے سکوت توڑتے ہوئے پوچھا۔

''فساد کے دنوں میں آپ دہلی ہی میں تھیں؟''

''جی ہاں ہم سب یہیں تھے۔''

میرے دل کو نہ معلوم کیا ہونے لگا۔ میں نے رکی رکی آواز میں پوچھا۔ ''آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟''

عورت نے قدرے سکوت کیا۔ ''بس کچھ نہ پوچھیے۔ مالی نقصان بہت ہوا، جانیں بچ گئیں۔ یہی غنیمت سمجھیے۔ کناٹ پلیس میں ہماری دکان لُٹ گئی۔ مکان میں فسادی گھس آئے ...... لیکن پیشتر اس کے کہ کوئی نقصان ہوتا پولس آگئی ......''

میرا سر جھک گیا...... ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ایسا کیوں ہوتا ہے؟

اسٹینڈ پر پہنچ کر بس رُک گئی۔

اس خیال سے کہ عورت تنہا ہے اور بچے دو، شاید اُسے میری مدد کی ضرورت ہو، میں نے اپنی سیٹ سے اٹھنے میں تامل کیا لیکن عورت کے ہلکے پن سے روشن ہوا کہ (اُسے) میری مدد درکار نہیں ہے۔ چنانچہ میں شریف مرد کی طرح اٹھ کر چل دیا۔

چند قدم چلنے کے بعد میں نے یونہی گھوم کر دیکھا کہ وہ عورت اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھ رہی ہے، لیکن اس کے قدم اکھڑے اکھڑے دکھائی دیتے تھے۔ وہ قدرے لنگڑا کر چل رہی تھی۔

میں سوچنے لگا کہ اگر اس کی ٹانگ میں یہ نقص نہ ہوتا تو وہ قدم قدم پر فتنے جگاتی۔ ایسی حسین عورت اور یہ عیب!

دفعتاً ہماری نظریں ملیں —— غالباً وہ سمجھے بیٹھی تھی میں چلا گیا ہوں۔ مجھے ایک مرتبہ پھر اپنے سامنے پا کر وہ پریشان سی ہوگئی جیسے کہہ رہی ہو۔ ''آخر تم نے مجھے لنگڑا کر چلتے ہوئے دیکھ لیا نا۔''

مجوب ہوکر اس نے اپنا گلابی ہوتا ہوا چہرہ جیسے جھکا لیا اور پھر جیسے روٹھ کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

میں اُسے منانے کے لیے آگے بڑھا اور اس کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔ ''معزز خاتون! تم بہت حسین ہو۔ تم حسن کی پتلی ہو، تم کیا جانو میں ان چند دلفریب لمحوں کے لیے تمھارا کس قدر شکرگزار ہوں۔'' ...... اور پھر میں نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ ''معاف کیجیے گا —— آپ کچھ پریشان سی نظر آتی ہیں۔ کیا آپ کو کہیں آگے جانا ہے۔ تانگہ لاؤں؟ ...... یا آپ کو کسی کا انتظار ہے؟''

اس نے سر پر دوپٹہ سنوارتے ہوئے جواب دیا۔ ''جی جانا تو قریب ہی ہے...... وہ نہیں آئے...... ملازم کو بھیج دیتے، ملازم کو تو آنا ہی چاہیے تھا......''

میں نے آگے بڑھ کر لڑکی کو گود میں اٹھا لیا اور بولا۔ ''چلیے میں آپ کو چھوڑ آؤں۔'' وہ بغیر کچھ کہے میرے ساتھ ہو لی۔

ابھی ہم پندرہ بیس قدم ہی چلے ہوں گے کہ وہ بول اٹھی۔ ''لیجیے وہ لڑکا ...... ہمارا نوکر چلا آرہا ہے۔''

ہم رک گئے۔ میں نے جھجکتے ہوئے ٹانگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔ ''کیا پیدائشی نقص ہے؟''

اس نے قدرے تامّل کیا۔ پھر اپنی آنکھیں میری آنکھوں میں ڈالتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ ''جی نہیں —— جب فسادیوں نے ہمارے مکان پر حملہ کیا تو ایک سور بیر نے لاٹھی گھما کر ماری تھی......''

میرا دل بیٹھنے لگا۔ لرزتے ہوئے ہاتھوں سے میں نے بچی کو نوکر کی طرف بڑھایا...... میری پیشانی پر ٹھنڈے پسینے کی بوندیں پھوٹ پڑیں۔ کانپتے ہوئے ہاتھ سے جیب میں رومال ٹٹولنے لگا۔

رخصت کے موقعے پر کچھ کہنا چاہا لیکن ہونٹ پھڑ پھڑا کر رہ گئے۔ چنانچہ میں کچھ اس انداز سے دو قدم پیچھے ہٹا جیسے وہ قدیم بابلیوں کی حسین شہزادی ہو۔ میری آنکھیں جھک کر اُس کے قدموں پر جم گئیں۔ میں نے تصوّر ہی تصوّر میں اس کے پاؤں پر سر رکھ دیا۔

پھر اچٹتی ہوئی نظروں سے اُس کی جانب دیکھا تو معلوم ہوا کہ اب ان آنکھوں میں وہ روکھا پن نہ تھا، نہ سختی اور پھر مجھے

© NCERT not to be republished

یوں محسوس ہوا کہ وہ مہربان ہوتی ہوئی کسی خودسر ملکہ کی طرح کہہ رہی ہے" مابدولت خوش ہوئے...... مابدولت نے نہ صرف تمھیں بلکہ تمھاری ساری قوم کو معاف کیا۔"

ایک مرتبہ پھر ہم نے ایک دوسرے کی جانب شکرگزار نظروں سے دیکھا—اور پھر ہم ایک دوسرے سے دور ہونے لگے۔ یہاں تک کہ بالآخر ایک دوسرے کی نظروں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو گئے۔

(بلونت سنگھ)

مشق

لفظ و معنی

سوم کا دن	:	سوم وار، پیر
مراسم	:	(رسم کی جمع) میل جول، تعلّقات
درخشاں	:	چمک دار
ہاتھ پاؤں پھولنا	:	(محاورہ) گھبرا جانا
خاطرخواہ	:	مرضی کے مطابق
مہمل	:	بے معنی
شانہ	:	کندھا
مؤثر	:	کارگر، اثر دار
رجوع کرنا	:	کسی سے مشورہ طلب کرنا
زانو	:	جانگھ، ران
قول	:	کہی ہوئی بات

© NCERT not to be republished

تائید	:	مدد کرنا، اتفاق کرنا، ساتھ دینا
خدوخال	:	ناک نقشہ
مہذّب	:	تہذیب یافتہ
موہنی	:	پُرکشش
تامّل	:	جھجک، دیر
سرزنش	:	ڈانٹ پھٹکار
اثبات میں سر ہلانا	:	کسی بات کو تسلیم کرنا
اقبال کرنا	:	مان لینا
ڈویٹ (DUET)	:	دوگانا، مردانہ اور نسوانی آوازوں میں ملا کر گایا ہوا گیت
خدشات	:	(خدشہ کی جمع) اندیشہ، خطرہ
کہنہ مشق	:	ماہر، تجربے کار
طفلانہ انداز	:	بچّوں جیسا ڈھنگ
محجوب ہونا	:	شرمندہ ہونا
سکوت	:	خاموشی
فتنے جگانا	:	ہنگامہ برپا کرنا، مصیبت کھڑی کرنا
دفعتاً	:	اچانک
مابدولت	:	ہم (بادشاہ اور شہزادے، شہزادیاں اپنے آپ کو ''ہم'' کے بجائے مابدولت کہتے تھے)

غور کرنے کی بات

- بلونت سنگھ نے یہ افسانہ، اس کے ایک کردار اُما کانت کی زبانی بیان کیا ہے۔ افسانہ ''لمحے'' کسی بہت نمایاں واقعے کے بجائے ایک دُکھ بھرے احساس پر مبنی ہے۔
- عورت کی گہری اداسی اور اُما کانت کی شدید شرمندگی کے ذریعے، بلونت سنگھ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ایک دوسرے کے دُکھوں میں شرکت ہی حقیقی انسانیت ہے۔

© NCERT not to be republished

سوالات

1. اس افسانے کا عنوان لمحے کیوں رکھا گیا ہے؟
2. بس کے مسافروں کے بارے میں افسانہ نگار نے جو تفصیل پیش کی ہے اسے اپنے لفظوں میں بیان کیجیے۔
3. اس افسانے کا مرکزی خیال کیا ہے؟

عملی کام

- اس افسانے میں جس واقعے کا بیان کیا گیا ہے اسے اپنے لفظوں میں لکھیے۔

© NCERT not to be republished

قرۃ العین حیدر

1927 تا 2008

قرّۃ العین حیدر علی گڑھ میں پیدا ہوئیں جہاں اُن کے والد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں رجسٹرار تھے۔ آبائی وطن نہٹور ضلع بجنور ہے۔ ان کے والد سجّاد حیدر یلدرم اور والدہ نذر سجّاد حیدر بھی اپنے دور کے معروف افسانہ نگار تھے۔ قرّۃ العین حیدر نے میٹرک اور بی۔ اے تک کی تعلیم بنارس اور دہرہ دون میں حاصل کی۔ 1947 میں ازابیلا تھوبورن کالج، لکھنؤ یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم۔ اے کیا۔ آرٹ اور ادب کی مزید تعلیم کے لیے لندن چلی گئیں۔ وہاں مشہور انگریزی اخبار ''ٹیلی گراف'' کے شعبۂ ادارت اور بی۔ بی۔ سی (ریڈیو) سے بھی وابستہ رہیں۔ وطن واپسی کے بعد کئی سال ممبئی میں قیام رہا، جہاں انگریزی رسائل ''اِمپرنٹ'' اور ''اِلّسٹر یٹیڈ ویکلی'' میں بطور مدیر کام کرتی رہیں۔ بعد میں اولاً علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اور پھر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں وِزِٹنگ پروفیسر کے منصب پر فائز رہیں۔

قرّۃ العین حیدر کا اوّلین افسانہ 1944 میں شائع ہوا تھا۔ افسانوں کا پہلا مجموعہ ''ستاروں کے آگے'' 1947 میں اور پہلا ناول ''میرے بھی صنم خانے'' 1949 میں منظرِ عام پر آیا۔ اردو اور انگریزی میں اُن کی تقریباً تیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں افسانوں کے مجموعے، ناول، ناولٹ، رپورتاژ، سفر نامے، ادبی مضامین اور عالمی ادب کے ترجمے شامل ہیں۔ اُن کے کئی افسانوں اور ناولوں کے ترجمے ہندوستان اور دنیا کی متعدد زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ ''آگ کا دریا''، ''آخرِ شب کے ہم سفر''، ''کارِ جہاں دراز ہے'' اور ''چاندنی بیگم'' ان کے مشہور ناول ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے افسانوں اور ناولوں کی زبان بہت رواں اور پرکشش ہے۔ ان کی تحریروں میں ہندوستان کی تاریخ اور تہذیب و ثقافت کی جھلکیوں نے خاص گہرائی پیدا کر دی ہے۔ اُنھیں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ، گیان پیٹھ ایوارڈ اور پدم بھوشن کا خطاب پیش کیا جا چکا ہے۔

© NCERT not to be republished

5257CH06

فوٹو گرافر

موسمِ بہار کے پھولوں سے گھِرا بے حد نظر فریب گیسٹ ہاؤس ہرے، بھرے ٹیلے کی چوٹی پر دور سے نظر آجاتا ہے۔ ٹیلے کے عین نیچے پہاڑی جھیل ہے۔ ایک بل کھاتی سڑک جھیل کے کنارے کنارے گیسٹ ہاؤس کے پھاٹک تک پہنچتی ہے۔ پھاٹک کے نزدیک والرس کی ایسی مونچھوں والا ایک فوٹو گرافر اپنا ساز و سامان پھیلائے ایک ٹین کی کرسی پر چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے۔ یہ گم نام پہاڑی قصبہ ٹورسٹ علاقہ میں نہیں ہے اس وجہ سے بہت کم سیّاح اس طرف آتے ہیں۔ چنانچہ جب کوئی ماہِ عسل منانے والا جوڑا یا کوئی مسافر گیسٹ ہاؤس میں آپہنچتا ہے تو فوٹو گرافر بڑی امید اور صبر کے ساتھ اپنا کیمرہ سنبھالے باغ کی سڑک پر ٹہلنے لگتا ہے۔ باغ کے مالی سے اس کا سمجھوتا ہے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہری کسی نوجوان خاتون کے لیے صبح سویرے گلدستہ لے جاتے وقت مالی فوٹو گرافر کو اشارہ کر دیتا ہے اور جب ماہِ عسل منانے والا جوڑا ناشتے کے بعد نیچے باغ میں آتا ہے تو مالی اور فوٹو گرافر دونوں ان کے انتظار میں چوکس ملتے ہیں۔

© NCERT not to be republished

فوٹو گرافر مدّتوں سے یہاں موجود ہے نہ جانے اور کہیں جا کر اپنی دوکان کیوں نہیں سجا تا لیکن وہ اسی قصبے کا باشندہ ہے۔ اپنی جھیل اور اپنی پہاڑی چھوڑ کر کہاں جائے۔ اس پھاٹک کی پُلیا پر بیٹھے بیٹھے اس نے بدلتی دنیا کے رنگا رنگ تماشے دیکھے ہیں۔ پہلے یہاں صاحب لوگ آتے تھے۔ برطانوی پلانٹرز سفید سولا ہیٹ پہنے، کولونیل سروس کے جغادری عہدے دار، اُن کی میم لوگ اور بابا لوگ۔ رات رات بھر... گراموفون ریکارڈ چیختے تھے اور گیسٹ ہاؤس کے نچلے ڈرائینگ روم کے چوبی فرش پر ڈانس ہوتا تھا۔ دوسری بڑی لڑائی کے زمانے میں امریکن آنے لگے تھے۔ پھر ملک کو آزادی ملی اور اِکّا دُکّا سیّاح آنے شروع ہوئے یا سرکاری افسر یا نئے بیاہے جوڑے یا مصور یا کلا کار جو تنہائی چاہتے ہیں۔ ایسے لوگ جو برسات کی شاموں کو جھیل پر جھکی دھنک کا نظارہ کرنا چاہتے ہیں، ایسے لوگ جو سکون اور محبت کے متلاشی ہیں جس کا زندگی میں وجود نہیں کیوں کہ ہم جہاں جاتے ہیں فنا ہمارے ساتھ ہے۔ فنا مسلسل ہماری ہم سفر ہے۔

گیسٹ ہاؤس میں مسافروں کی آوک جاوک جاری ہے۔ فوٹو گرافر کے کیمرے کی آنکھ یہ سب دیکھتی ہے اور خاموش رہتی ہے۔

ایک روز شام پڑے ایک نوجوان اور ایک لڑکی گیسٹ ہاؤس میں آن کر اترے۔ یہ دونوں، انداز سے ماہِ عسل منانے والے معلوم نہیں ہوتے تھے لیکن بے حد مسرور اور سنجیدہ سے، وہ اپنا سامان اٹھائے اوپر چلے گئے۔ اوپر کی منزل بالکل خالی پڑی تھی۔ زینے کے برابر میں ڈائننگ ہال تھا اور اس کے بعد تین بیڈ روم۔

''یہ کمرہ میں لوں گا''۔ نوجوان نے پہلے بیڈ روم میں داخل ہو کر کہا جس کا رخ جھیل کی طرف تھا۔ لڑکی نے اپنی چھتری اور اوورکوٹ اس کمرے کے ایک پلنگ پر پھینک دیا تھا۔

''اٹھاؤ اپنا بوریا بستر۔'' نوجوان نے اس سے کہا۔

''اچھا............'' لڑکی دونوں چیزیں اٹھا کر برابر کے سٹنگ روم سے گزرتی دوسرے کمرے میں چلی گئی جس کے پیچھے ایک پختہ گلیارا سا تھا۔ کمرے کے بڑے بڑے دریچوں میں سے وہ مزدور نظر آرہے تھے جو ایک سیڑھی اٹھائے پچھلی دیوار کی مرمّت میں مصروف تھے۔

ایک بیرا لڑکی کا سامان لے کر اندر آیا اور دریچوں کے پردے برابر کر کے چلا گیا۔ لڑکی سفر کے کپڑے تبدیل کر کے سٹنگ روم میں آ گئی۔ نوجوان آتش دان کے پاس ایک آرام کرسی پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا، اس نے نظریں اٹھا کر لڑکی کو دیکھا۔ باہر جھیل پر دفعتاً اندھیرا چھا گیا تھا وہ دریچے میں کھڑی ہو کر باغ کے دھندلکے کو دیکھنے لگی۔ پھر وہ بھی ایک کرسی پر بیٹھ گئی، نہ جانے وہ دونوں کیا باتیں کرتے رہے۔ فوٹو گرافر جو اب بھی نیچے پھاٹک پر بیٹھا تھا، اس کا کیمرہ آنکھ رکھتا تھا لیکن سماعت سے عاری تھا۔

© NCERT not to be republished

کچھ دیر بعد وہ دونوں کھانا کھانے کے کمرے میں گئے اور دریچے سے لگی ہوئی میز پر بیٹھ گئے۔ جھیل کے دوسرے کنارے پر قصبے کی روشنیاں جھلملا اٹھی تھیں۔

اس وقت تک ایک یورپین سیّاح بھی گیسٹ ہاؤس میں آچکا تھا۔ وہ خاموش ڈائننگ ہال کے دوسرے کونے میں چپ چاپ بیٹھا خط لکھ رہا تھا، چند پکچر پوسٹ کارڈ اس کے سامنے میز پر رکھے تھے۔

''سیّاح اپنے گھر خط لکھ رہا ہے کہ میں اس وقت پُر اسرار مشرق کے ایک پُر اسرار ڈاک بنگلے میں موجود ہوں۔ سرخ ساری میں ملبوس ایک پراسرار ہندوستانی لڑکی میرے سامنے بیٹھی ہے۔ بڑا ہی رومانٹک ماحول ہے!'' لڑکی نے چپکے سے کہا۔ اس کا ساتھی ہنس پڑا۔

کھانے کے بعد وہ دونوں پھر سٹنگ روم میں آ گئے۔ نوجوان اب اسے کچھ پڑھ کر سنا رہا تھا۔ رات گہری ہوتی گئی۔ دفعتاً لڑکی کو زور کی چھینک آئی اور اس نے سوں سوں کرتے ہوئے کہا۔ ''اب سونا چاہیے۔''

''تم اپنی زکام کی دوا پینا نہ بھولنا''۔ نوجوان نے فکر سے کہا۔

''ہاں شب بخیر......'' لڑکی نے جواب دیا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔

پچھلا گلیارا گھپ اندھیرا پڑا تھا، کمرا بے حد پرسکون، خنک اور آرام دہ تھا، زندگی بے حد پرسکون اور آرام دہ تھی، لڑکی نے کپڑے تبدیل کر کے سنگھار میز کی دراز کھول کر دوا کی شیشی نکالی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے اپنا سیاہ کیمونو پہن کر دروازہ کھولا، نوجوان ذرا گھبرایا ہوا سامنے کھڑا تھا۔ ''مجھے بھی بڑی سخت کھانسی اٹھ رہی ہے۔'' اس نے کہا۔

''اچھا......'' لڑکی نے دوا کی شیشی اور چمچہ اسے دیا۔ چمچہ نوجوان کے ہاتھ سے چھٹ کر فرش پر گر گیا، اس نے جھک کر چمچہ اٹھایا اور اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ لڑکی روشنی بجھا کر سو گئی۔

صبح کو وہ ناشتے کے لیے ڈائننگ روم میں گئی۔ زینے کے برابر والے ہال میں پھول مہک رہے تھے۔ تانبے کے بڑے بڑے گلدان براسو سے چمکائے جانے کے بعد ہال کے جھلملاتے چوبی فرش پر ایک قطار میں رکھ دیے گئے تھے اور تازہ پھولوں کے انبار ان کے نزدیک رکھے ہوئے تھے۔ باہر سورج نے جھیل کو روشن کر دیا تھا اور زرد و سفید تتلیاں سبزے پر اڑتی پھر رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد نوجوان ہنستا ہوا زینے پر نمودار ہوا، اس کے ہاتھ میں گلاب کے پھولوں کا ایک گُچھّا تھا۔

''مالی نیچے کھڑا ہے، اس نے یہ گلدستہ تمھارے لیے بھجوایا ہے''۔ اس نے کمرے میں داخل ہو کر مسکراتے ہوئے کہا اور گلدستہ میز پر رکھ دیا۔

لڑکی نے ایک شگوفہ اٹھا کر بے خیالی سے اسے اپنے بالوں میں لگا لیا اور اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گئی۔

''ایک فوٹوگرافر بھی نیچے منڈلا رہا ہے، اس نے مجھ سے بڑی سنجیدگی سے تمھارے متعلق دریافت کیا کہ تم فلاں فلم اسٹار تو نہیں؟''
نوجوان نے کرسی پر بیٹھ کر چائے بناتے ہوئے کہا۔

لڑکی ہنس پڑی۔ وہ ایک نامور رقّاصہ تھی۔ مگر اس جگہ پر کسی نے اس کا نام بھی نہ سنا تھا۔ نوجوان اس لڑکی سے بھی زیادہ مشہور موسیقار تھا مگر اسے بھی یہاں کوئی نہ پہچان سکا تھا۔ ان دونوں کو اپنی اس عارضی گم نامی اور مکمل سکون کے یہ مختصر لمحات بہت بھلے معلوم ہوئے۔

کمرے کے دوسرے کونے میں ناشتہ کرتے ہوئے اکیلے یوروپین نے آنکھیں اٹھا کر ان دونوں کو دیکھا اور ذرا سا مسکرایا۔ وہ بھی ان دونوں کی خاموش مسرت میں شریک ہو چکا تھا۔

ناشتے کے بعد وہ دونوں نیچے گئے اور باغ کے کنارے گُل مہر کے نیچے کھڑے ہو کر جھیل کو دیکھنے لگے۔ فوٹوگرافر نے اچانک چھلاوے کی طرح نمودار ہو کر بڑے ڈرامائی انداز میں ٹوپی اتاری اور ذرا جھک کر کہا۔

''فوٹوگراف ۔ لیڈی؟''

لڑکی نے گھڑی دیکھی۔ ''ہم لوگوں کو ابھی باہر جانا ہے۔ دیر ہو جائے گی۔''

''لیڈی......'' فوٹوگرافر نے پاؤں منڈیر پر رکھا اور ایک ہاتھ پھیلا کر باہر کی دنیا کی سمت اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا'' باہر کارزارِ حیات میں گھمسان کا رن پڑا ہے۔ مجھے معلوم ہے اس گھمسان سے نکل کر آپ دونوں خوشی کے چند لمحے چرانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ دیکھیے اس جھیل کے اوپر دھنک پَل کی پل میں غائب ہو جاتی ہے۔ لیکن میں آپ کا زیادہ وقت نہ لوں گا......ادھر آیئے۔''

''بڑا السّان فوٹوگرافر ہے۔'' لڑکی نے چپکے سے اپنے ساتھی سے کہا۔

مالی جو گویا اب تک اپنے کیو کا منتظر تھا دوسرے درخت کے پیچھے سے نکلا اور لپک کر ایک اور گلدستہ لڑکی کو پیش کیا۔ لڑکی کھل کھلا کر ہنس پڑی وہ اور اس کا ساتھی امرسندری پاروتی کے مجسمے کے قریب جا کھڑے ہوئے۔ لڑکی کی آنکھوں میں دھوپ آ رہی تھی اس لیے اس نے ذرا مسکراتے ہوئے آنکھیں ذرا سی چندھیا دی تھیں۔

کِلک ...... کِلک ......تصویر اتر گئی۔

''تصویر آپ کو شام کو مل جائے گی......تھینک یو لیڈی......تھینک یو سر......فوٹوگرافر نے ذرا سا جھک کر دوبارہ ٹوپی چھوئی۔

لڑکی اور اس کا ساتھی کار کی طرف چلے گئے۔

سیر کر کے وہ دونوں شام پڑے لوٹے اور سندھیا کی نارنجی روشنی میں دیر تک باہر گھاس پر پڑی کرسیوں پر بیٹھے رہے۔ جب کہرا گرنے لگا تو اندر نچلی منزل کے وسیع اور خاموش ڈرائینگ روم میں نارنجی قمقموں کی روشنی میں آ بیٹھے۔ نہ جانے کیا باتیں کر رہے

تھے جو کسی طرح ختم ہونے ہی میں نہ آتی تھیں۔ کھانے کے وقت وہ اوپر چلے گئے۔ صبح سویرے وہ واپس جارہے تھے اور اپنی باتوں کی محویت میں ان کو فوٹو گرافر اور اس کی کھینچی ہوئی تصویر یاد بھی نہ رہی تھی۔

صبح کو لڑکی اپنے کمرے میں تھی جب بیرے نے اندر آکر ایک لفافہ پیش کیا۔

''پھوٹو (فوٹو) گرافر صاحب یہ رات کو دے گئے تھے۔'' اس نے کہا۔

''اچھا۔ اس سامنے والی دراز میں رکھ دو۔'' لڑکی نے بے خیالی سے کہا اور بال بنانے میں جُٹی رہی۔

ناشتے کے بعد سامان باندھتے ہوئے اُسے وہ دراز کھولنا یاد نہ رہا اور جاتے وقت خالی کمرے پر ایک سرسری سی نظر ڈال کر وہ تیز تیز چلتی کار میں بیٹھ گئی۔ نوجوان نے کار اسٹارٹ کردی (کار) پھاٹک سے باہر نکلی۔ فوٹو گرافر نے پُلیا پر سے اٹھ کر ٹوپی اتاری۔ مسافروں نے مسکرا کر ہاتھ ہلائے۔ کار ڈھلوان سے نیچے روانہ ہوگئی۔

وہ والرس کی ایسی مونچھوں والا فوٹو گرافر بہت بوڑھا ہو چکا ہے اور اسی طرح اس گیسٹ ہاؤس کے پھاٹک پر ٹین کی کرسی بچھائے بیٹھا رہتا ہے اور سیاحوں کی تصویریں اتارتا رہتا ہے جو اَب نئی فضائی سروس شروع ہونے کی وجہ سے بڑی تعداد میں اس طرف آنے لگے ہیں۔

لیکن اس وقت ایئر پورٹ سے جو ٹورسٹ کوچ آکر پھاٹک میں داخل ہوئی اُس میں سے صرف ایک خاتون اپنا اٹیچی کیس اٹھائے برآمد ہوئیں اور ٹھٹک کر انھوں نے فوٹو گرافر کو دیکھا، جو کوچ کو دیکھتے ہی فوراً اُٹھ کھڑا ہوا تھا مگر کسی جوان اور حسین لڑکی کے بجائے ایک ادھیڑ عمر کی بی بی کو دیکھ کر مایوسی سے دوبارہ جا کر اپنی ٹین کی کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

خاتون نے دفتر میں جا کر رجسٹر میں اپنا نام درج کیا اور اوپر چلی گئیں۔ گیسٹ ہاؤس سنسان پڑا تھا۔ سیاحوں کی ایک ٹولی ابھی ابھی آگے روانہ ہوئی تھی اور بیرے کمرے کی جھاڑ پونچھ کر چکے تھے۔ تانبے کے گلدان تازہ پھولوں کے انتظار میں ہال کے فرش پر رکھے جھل جھل کر رہے تھے اور ڈائننگ ہال میں دریچے کے نیچے سفید برّاق میز پر چھری کانٹے جگمگا رہے تھے۔ نو وارد خاتون درمیانی بیڈ روم میں سے گذر کر پچھلے کمرے میں چلی گئیں اور اپنا سامان رکھنے کے بعد پھر باہر آکر جھیل کو دیکھنے لگیں۔ چائے کے بعد وہ خالی سِٹنگ روم میں جا بیٹھیں اور رات ہوئی تو جا کر اپنے کمرے میں سو گئیں۔ گلیارے میں سے کچھ پرچھائیوں نے اندر جھانکا تو وہ اٹھ کر دریچے میں گئیں جہاں مزدور دن بھر کام کرنے کے بعد سیڑھی دیوار سے لگی چھوڑ گئے تھے۔ گلیارا بھی سنسان پڑا تھا۔ وہ پھر پلنگ پر آکر لیٹیں تو چند منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ انھوں نے دروازہ کھولا باہر کوئی نہ تھا۔ سٹنگ روم بھائیں بھائیں کر رہا تھا، وہ پھر آکر لیٹ رہیں، کمرہ بہت سرد تھا۔

صبح اٹھ کر انھوں نے اپنا سامان باندھتے ہوئے سنگھار میز کی دراز کھولی تو اس کے اندر بچھے پیلے کاغذ کے نیچے سے ایک

لفافے کا کونا نظر آیا جس پر ان کا نام لکھا تھا۔ خاتون نے ذرا تعجب سے لفافہ باہر نکالا۔ ایک کا کروچ کاغذ کی تہہ میں سے نکل کر خاتون کی انگلی پر آ گیا۔ انھوں نے دہل کر انگلی جھٹکی اور لفافے میں سے ایک تصویر سرک کر نیچے گر گئی۔

جس میں ایک نوجوان اور ایک لڑکی امر سندری پاروتی کے مجسمے کے قریب کھڑے مسکرا رہے تھے۔ تصویر کا کاغذ پیلا پڑ چکا تھا۔ خاتون چند لمحوں تک گم سم اس تصویر کو دیکھتی رہیں پھر اسے اپنے بیگ میں رکھ لیا۔

بیرے نے باہر سے آواز دی کہ ایئر پورٹ جانے والی کوچ تیار ہے۔ خاتون نیچے گئیں۔ فوٹوگرافر نئے مسافروں کی تاک میں باغ کی سڑک پر ٹہل رہا تھا اس کے قریب جا کر خاتون نے بے تکلفی سے کہا:

''کمال ہے پندرہ برس میں کتنی بار سنگھار میز کی صفائی کی گئی ہوگی مگر یہ تصویر کاغذ کے نیچے اسی طرح پڑی رہی''۔ پھر ان کی آواز میں جھلاّہٹ آ گئی اور یہاں کا انتظام کتنا خراب ہو گیا ہے۔ کمرے میں کاکروچ ہی کاکروچ......''

فوٹوگرافر نے چونک کر ان کو دیکھا اور پہچاننے کی کوشش کی۔ پھر خاتون کے جھرّیوں والے چہرے پر نظر ڈال کر آرام سے دوسری طرف دیکھنے لگا، خاتون کہتی رہیں...... ان کی آواز بھی بدل چکی تھی چہرے پر درشتی اور سختی تھی اور انداز میں چڑچڑاپن اور بےزاری اور وہ سپاٹ آواز میں کہے جا رہی تھیں:

''میں اسٹیج سے ریٹائر ہو چکی ہوں اب میری تصویریں کون کھینچے گا بھلا، میں اپنے وطن واپس جاتے ہوئے رات یہاں ٹھہر گئی تھی۔ نئی ہوائی سروس شروع ہو گئی ہے۔ یہ جگہ راستے میں پڑتی ہے۔''

''اور......اور......آپ کے ساتھی؟'' فوٹوگرافر نے آہستہ سے پوچھا۔

کوچ نے ہارن بجایا۔

''آپ نے کہا تھا نا کہ کارزارِ حیات میں گھمسان کا رن پڑا ہے۔ اسی گھمسان میں وہ کہیں کھو گئے۔''

کوچ نے دوبارہ ہارن بجایا۔

''اور ان کو کھوئے ہوئے بھی مدّت گزر گئی......اچھا خدا حافظ۔'' خاتون نے بات ختم کی اور تیز تیز قدم رکھتی کوچ کی طرف چلی گئیں۔

والرس کی ایسی مونچھوں والا فوٹوگرافر پھاٹک کے نزدیک جا کر اپنی ٹین کی کرسی پر بیٹھ گیا۔

زندگی انسانوں کو کھا گئی۔ صرف کاکروچ باقی رہیں گے۔

(قرۃُ العین حیدر)

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی

نظر فریب	:	نگاہوں کو دھوکا دینے والا، بے حد خوب صورت
عین	:	بالکل
والرس	:	ایک قسم کی بیل جس کے باریک ریشے نیچے کی طرف لٹکتے رہتے ہیں
ٹورسٹ	:	سیّاح
ماہِ عسل	:	ہنی مون (Honey Moon)
چوکس	:	تیّار، چاق چوبند
صاحب لوگ	:	برطانوی دور کے دولت منداور سرکاری عہدے دار
جُغادری	:	بھاری بھرکم، جہاں دیدہ
چوبی	:	لکڑی کا بنا ہوا۔(چوب،لکڑی)
دوسری بڑی لڑائی	:	دوسری عالمی جنگ (جو 1939 میں شروع اور 1945 میں ختم ہوئی)
متلاشی	:	تلاش کرنے والا
فنا	:	موت، خاتمہ
آوک جاوک	:	آنا جانا، آمد و رفت
سٹنگ روم	:	نشست گاہ
گلیارا	:	گیلری، بالکنی
دریچہ	:	کھڑکی
آتش دان	:	کمرے کی دیوار میں، فرش کے قریب بنی ہوئی انگیٹھی
پکچر پوسٹ کارڈ	:	وہ کارڈ جن پر مشہور مقامات کی تصویریں چھپی ہوئی ہوتی ہیں۔ سیّاح اُن پر اپنے دوستوں اور رشتے داروں کو خط لکھتے ہیں تو انھیں خیریت کے ساتھ اس مقام کی ایک جھلک بھی مل جاتی ہے جہاں سے کارڈ روانہ کیا جاتا ہے۔

© NCERT not to be republished

دفعتاً	:	اچانک
شب بخیر	:	''گڈ نائٹ'' کا متبادل، خدا کرے کہ رات خیریت کے ساتھ گزرے
کیمونو	:	جاپانی خواتین کا ایک خاص لباس
براسو	:	تانبے پیتل کو چمکانے والی مخصوص پالش
شگوفہ	:	کلی
نامور	:	مشہور، معروف
کارزار	:	لڑائی، مقابلہ
رن	:	جنگ
گھمسان (گھماسان)	:	زوردار لڑائی
لسّان	:	باتونی
امر سندری پاروتی	:	شیو جی کی پتنی پاروتی جی کے حسن کو کبھی نہ فنا ہونے والا کہا جاتا ہے اِس لحاظ سے پاروتی جی کا لقب امر سندری ہے
سندھیا	:	شام
نارنجی	:	زردی مائل سرخ رنگ (سنترے کا رنگ)
سرسری نظر	:	اُچٹتی ہوئی نظر
جھل جھل کرنا	:	جگمگ جگمگ کرنا، چاندی سونے کی چمک دمک کو ''جھلا جھل'' کہتے ہیں۔اُسی سے یہ صفت بنائی گئی ہے

غور کرنے کی بات

- قرۃ العین حیدر کے افسانے عام طور پر طویل ہوتے ہیں ۔ فوٹوگرافر اُن کا مختصر افسانہ ہے ۔ اختصار کے باوجود اس میں قرۃ العین حیدر کا ''تصوّرِ وقت'' صاف جھلک رہا ہے۔ اجتماعی زوال اور انسانی زندگی میں ''وقت'' کا عمل دخل قرۃ العین حیدر کا خاص موضوع ہے۔

© NCERT not to be republished

- افسانے کا یہ جملہ:

''گیسٹ ہاؤس میں مسافروں کی آوک جاوک جاری ہے۔''اس خیال کی تائید کرتا ہے کہ مصنفہ، دنیا کو مہمان خانہ محسوس کرانا چاہتی ہیں۔ دوسرا جملہ بتارہا ہے کہ'' کیمرے کی آنکھ یہ سب دیکھتی ہے اور خاموش رہتی ہے۔'' گویا فوٹو گرافر شخص کے بجائے وہ ذہن ہے جو سارے بھید جانتا ہے اور وہ نظر ہے جو حالات، واقعات اور افراد کے ذہن کی گہرائیوں تک پہنچ جاتی ہے۔

- یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ قرۃ العین حیدر نے کائنات میں فنا کے تسلسل کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ افسانے میں وہ پُرکشش اور دل کو لبھانے والی چیزیں بھی شامل کی ہیں جو انسانی زندگی کو بامعنی بناتی ہیں: یوروپین سیّاح دنیا دیکھنے نکلا ہے۔ وہ دیکھی ہوئی جگہوں اور چیزوں کے عکس خاندان کے لوگوں اور دوستوں کو بھیج کر اپنا دیکھا بھالا اُنھیں بھی دکھا رہا ہے۔ لوگ اسی مہمان خانے میں ماہِ عسل منانے آتے ہیں۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں آپس میں چہلیں بھی کر رہے ہیں۔ لازماً فنا ہونے والے افراد: زکام کی بھی دوا کرتے ہیں۔ سرد موسم سے بچنے کے لیے آگ کے پاس بیٹھتے ہیں اور کیمونو پہن کر دروازہ کھولتے ہیں کہ کہیں ٹھنڈی ہوا نہ لگ جائے۔ یعنی اٹل فنا کے سائے میں زندگی کے رنگا رنگ تماشے جاری ہیں۔

سوالات

1. گم نام پہاڑی کے گیسٹ ہاؤس میں سیّاح کیوں آتے تھے؟
2. افسانے میں فوٹوگرافر کے کردار پر روشنی ڈالیے۔
3. افسانے میں زندگی کی کس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے؟
4. قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری کی خصوصیات تحریر کیجیے۔

عملی کام

- اِس افسانے کو بار بار پڑھیے اور جہاں کوئی بات سمجھ میں نہ آئے، اسے استاد سے دریافت کیجیے۔

© NCERT not to be republished

سُریندر پرکاش

1930 تا 2002

سریندر پرکاش (اصل نام : سریندر کمار او برائے) غیر منقسم پنجاب کے شہر لائل پور (فیصل آباد) میں پیدا ہوئے۔ گھریلو پریشانیوں کے باعث باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کرسکے۔ 1947 میں والدین کے ساتھ دہلی پہنچے جہاں حصولِ معاش کے لیے انھوں نے محنت مزدوری اور چھوٹی موٹی ملازمتیں کیں۔ کتب فروشوں کے لیے فرضی ناموں سے کہانیاں اور ناول لکھے، ریڈیو میں جزوقتی طور پر اسکرپٹ رائٹر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ اسی دوران میں جامعہ اردو، علی گڑھ کے امتحان (ادیب و ادیب کامل وغیرہ) بھی پاس کیے۔

سریندر پرکاش کا پہلا افسانہ ''دیوتا'' لاہور کے ایک ہفت وار ''پارس'' میں شائع ہوا تھا۔ دہلی پہنچنے کے کئی سال بعد، اپنے ذوق کے مطابق لکھنے کا موقع نصیب ہوا تو انھوں نے ''نئے قدموں کی چاپ'' اور ''رونے کی آواز'' جیسے علامتی اور تجریدی افسانے تحریر کیے۔ سریندر پرکاش کے افسانوں میں نت نئے روپ اختیار کرنے والا طنز اور ملال کا عنصر نمایاں ہے۔ یہ افسانے موجودہ دنیا کے تصنّع، مکر وفریب، فطرت سے دوری اور تہذیبی وفکری زوال کی نشان دہی بھی کرتے ہیں۔ سریندر پرکاش کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم'' 1968 میں، دوسرا مجموعہ ''برف پر مکالمہ'' 1981 میں، تیسرا مجموعہ ''بازگوئی'' 1988 میں اور چوتھا ''حاضر، حال، جاری'' 2002 میں شائع ہوا۔ سریندر پرکاش کو کئی ریاستی ادبی اعزاز اور مجموعہ ''بازگوئی'' پر ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ پیش کیا گیا۔ افسانہ ''بجوکا'' اسی مجموعے میں شامل ہے۔

© NCERT not to be republished

بجوکا

پریم چند کی کہانی کا ہوری اتنا بوڑھا ہو چکا تھا کہ اس کی پلکوں اور بھوؤں تک کے بال سفید ہو گئے تھے، کمر میں خم پڑ گیا تھا اور ہاتھوں کی نسیں سانولے کھُردرے گوشت میں سے اُبھر آئی تھیں۔

اس اثنا میں اُس کے ہاں دو بیٹے ہوئے تھے، جو اَب نہیں رہے۔ ایک گنگا میں نہا رہا تھا کہ ڈوب گیا اور دوسرا پولیس مقابلے میں مارا گیا۔ پولیس کے ساتھ اس کا مقابلہ کیوں ہوا، اس میں کچھ ایسی بتانے کی بات نہیں۔ جب بھی کوئی آدمی اپنے وجود سے واقف ہوتا ہے اور اپنے اِردگرد پھیلی ہوئی بے چینی محسوس کرنے لگتا ہے تو اُس کا پولیس کے ساتھ مقابلہ ہو جانا قدرتی ہو جاتا ہے، بس ایسا ہی کچھ اُس کے ساتھ بھی ہوا تھا— اور بوڑھے ہوری کے ہاتھ ہل کے ہتھے کو تھامے ہوئے ایک بار ڈھیلے پڑے، ذرا کانپے اور پھر ان کی گرفت اپنے آپ مضبوط ہو گئی اس نے بیلوں کو ہانک لگائی اور ہل کا پھل زمین کا سینہ چیرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

اُن دونوں بیٹوں کی بیویاں تھیں اور آگے ان کے پانچ بچّے۔ تین گنگا میں ڈوبنے والے کے اور دو پولیس مقابلے میں مارے جانے والے کے۔ اب ان سب کی پرورش کا بار ہوری پر آن پڑا تھا، اور اس کے بوڑھے جسم میں خون زور سے گردش کرنے لگا تھا۔

اُس دن آسمان سورج نکلنے سے پہلے کچھ زیادہ ہی سرخ تھا اور ہوری کے آنگن کے کنویں کے گرد پانچوں بچّے ننگ دھڑنگ بیٹھے نہا رہے تھے۔ اُس کی بڑی بہو کنویں سے پانی نکال نکال کر اُن پر باری باری اُنڈیلتی جا رہی تھی اور وہ اچھلتے ہوئے اپنا پنڈا ملتے پانی اُچھال رہے تھے— چھوٹی بہو بڑی بڑی روٹیاں بنا کر چنگیری میں ڈال رہی تھی اور ہوری اندر کپڑے بدل کر پگڑی باندھ رہا تھا۔ پگڑی باندھ کر اس نے طاقچے میں رکھے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ سارے چہرے پر لکیریں پھیل گئی تھیں۔ اس نے قریب ہی لٹکی ہوئی ہنومان جی کی چھوٹی سی تصویر کے سامنے آنکھیں بند کر کے دونوں ہاتھ جوڑ کر سر جھکایا اور پھر دروازے میں سے گزر کر باہر آنگن میں آ گیا۔

''سب تیّار ہیں۔؟'' اُس نے قدرے اونچی آواز میں پوچھا۔

''ہاں باپو— '' سب بچّے ایک ساتھ بُول اُٹھے۔ بہوؤں نے اپنے سروں پر پلّو درست کیے اور اُن کے ہاتھ تیزی سے

5257CH07
© NCERT not to be republished

چلنے لگے۔ ہوری نے دیکھا ابھی کوئی بھی تیّار نہیں تھا— سب جھوٹ بول رہے تھے — اس نے سوچا یہ جھوٹ ہماری زندگی کے لیے کتنا ضروری ہے، اگر بھگوان نے ہمیں جھوٹ جیسی نعمت نہ دی ہوتی تو لوگ دھڑا دھڑ مرنے لگ جاتے۔ اُن کے پاس جینے کا کوئی بہانہ نہ رہ جاتا۔ ہم پہلے جھوٹ بولتے ہیں اور پھر اُسے سچ ثابت کرنے کی کوشش میں دیر تک زندہ رہتے ہیں۔

ہوری کے پوتے ، پوتیاں اور بہوئیں — ابھی ابھی بولے ہوئے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے میں پوری تند ہی سے جُٹ گئیں۔ جب تک ہوری نے ایک کونے میں پڑے کٹائی کے اوزار نکالے — اور اب وہ سچ مچ تیار ہو چکے تھے۔

اُن کا کھیت لہلہا اُٹھا تھا۔ فصل پک گئی تھی اور آج کٹائی کا دن تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی تہوار ہو۔ سب بڑے چاؤ سے جلد از جلد کھیت پر پہنچنے کی کوشش میں تھے کہ انھوں نے دیکھا سورج کی سنہری کرنوں نے سارے گھر کو اپنے جادو میں جکڑ لیا ہے۔

ہوری نے انگوچھا کندھے پر رکھتے ہوئے سوچا۔ کتنا اچھا سمے آ پہنچا ہے۔ نہ اہلمد کی دھونس، نہ بنیے کا کھٹکا، نہ انگریز کی زور زبردستی اور نہ زمیندار کا حصّہ — اس کی نظروں کے سامنے ہرے ہرے خوشے جھوم اُٹھے۔

''چلو باپو'' اُس کے بڑے پوتے نے اس کی انگلی پکڑ لی، باقی بچّے اس کی ٹانگوں کے ساتھ لپٹ گئے۔ بڑی بہو نے کوٹھری کا دروازہ بند کیا اور چھوٹی بہو نے روٹیوں کی پوٹلی سر پر رکھی۔

بیر بجرنگی کا نام لے کر سب باہر کی چار دیواری والے دروازے میں سے نکل کر گلی میں آ گئے اور پھر دائیں طرف مڑ کر اپنے کھیت کی طرف بڑھنے لگے۔

گاؤں کی گلیوں، گلیاروں میں چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ لوگ کھیتوں کو آ جا رہے تھے۔ سب کے دلوں میں مسرّت کے انار پھوٹتے محسوس ہو رہے تھے۔ سب کی آنکھیں پکّی فصلیں دیکھ کر چمک رہی تھیں۔ ہوری کو لگا جیسے زندگی کل سے آج ذرا مختلف ہے۔ اس نے پلٹ کر اپنے پیچھے آتے ہوئے بچّوں کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل ویسے ہی لگ رہے تھے جیسے کسان کے بچے ہوتے ہیں۔ سانولے مریل سے — جو جیپ گاڑی کے پہیوں کی آواز اور موسم کی آہٹ سے ڈر جاتے ہیں۔ بہوئیں ویسی ہی تھیں جیسی کہ غریب کسان بیوہ عورتیں ہوتی ہیں۔ چہرے گھونگھٹوں میں چھپے ہوئے اور لباس کی ایک ایک سلوٹ میں غریبی جوؤں کی طرح چھپی بیٹھی۔

وہ سر جھکا کر پھر آگے بڑھنے لگا۔ گاؤں کے آخری مکان سے گزر کر آگے کھُلے کھیت تھے۔ قریب ہی رہٹ خاموش کھڑا تھا، نیم کے درخت کے نیچے ایک کُتّا بے فکری سے سویا ہوا تھا۔ دور طویلے میں کچھ گائیں، بھینسیں اور بیل چارہ کھا کر پھنکار رہے تھے۔ سامنے دور دور تک لہلہاتے ہوئے سنہری کھیت تھے — ان سب کھیتوں کے بعد، ذرا دور، جب یہ سب کھیت ختم ہو جائیں گے اور پھر، چھوٹا سا نالہ پار کر کے الگ تھلگ ہوری کا کھیت تھا۔ جس میں جھونا پک کر انگڑائیاں لے رہا تھا وہ سب پگڈنڈیوں پر چلتے

© NCERT not to be republished

ہوئے دور سے ایسے لگ رہے تھے جیسے رنگ برنگے کیڑے گھاس پر رینگ رہے ہوں۔ وہ سب کھیت کی طرف جا رہے تھے جس کے آگے تھل تھا۔ دور دور تک پھیلا ہوا، جس میں کہیں ہریالی نظر نہ آتی تھی بس تھوڑی بے جان مٹّی تھی جس میں پاؤں رکھتے ہی دھنس جاتا تھااور مٹی یوں بھُر بھُری ہوگئی تھی جیسے ان کے دونوں بیٹوں کی ہڈیاں چتا میں جل کر پھول بن گئی تھیں اور پھر ہاتھ لگاتے ہی ریت کی طرح بکھر جاتی تھیں۔ وہ تھل دھیرے دھیرے بڑھ رہا تھا۔ ہوری کو یاد آیا پچھلے پچاس برسوں میں وہ دو ہاتھ آگے بڑھ آیا تھا۔ ہوری چاہتا تھا، جب تک بچّے جوان ہوں وہ تھل اُس کے کھیت تک نہ پہنچے۔اور تب تک وہ خود کسی تھل کا حصّہ بن چکا ہوگا۔

پگڈنڈیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ اور اُس پر ہوری اور اُس کے خاندان کے لوگوں کے حرکت کرتے ہوئے ننگے پاؤں ....

سورج آسمان کی مشرقی کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھ رہا تھا۔

چلتے چلتے اُن کے پاؤں مٹی سے اَٹ گئے تھے۔کئی ارد گرد کے کھیتوں میں لوگ کٹائی کرنے میں مصروف تھے، وہ آتے جاتے کو رام رام کہتے اور پھر کسی انجانے جوش اور ولولے کے ساتھ ٹہنیوں کو درانتی سے کاٹ کر ایک طرف رکھ دیتے۔

انھوں نے باری باری نالہ پار کیا۔ نالے میں پانی نام کو بھی نہ تھا بہنے کو— اندر کی ریت ملی مٹی بالکل خشک ہو چکی تھی اور اس پر عجیب وغریب نقش ونگار بنے تھے۔ وہ پانی کے پاؤں کے نشان تھے۔ اور سامنے لہلہاتا ہوا کھیت نظر آ رہا تھا۔ سب کا دل بلّیوں اچھلنے لگا— فصل کٹے گی تو ان کا آنگن پھوس سے بھر جائے گا اور کوٹھڑی اناج سے، پھر کھٹیا پر بیٹھ کر بھات کھانے کا مزہ آئے گا۔ کیا ڈکاریں آئیں گی پیٹ بھر جانے کے بعد۔ اُن سب نے ایک ہی بار سوچا۔

اچانک ہوری کے قدم رُک گئے۔ وہ سب بھی رُک گئے۔ ہوری کھیت کی طرف حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ سب کبھی ہوری اور کبھی کھیت کو دیکھ رہے تھے کہ اچانک ہوری کے جسم میں جیسے بجلی کی سی پھُرتی پیدا ہوئی۔ اس نے چند قدم آگے بڑھ کر بڑے جوش سے آواز لگائی۔

''ابے کون ہے... ے... ے—؟''

اور پھر سب نے دیکھا اُن کے کھیت میں پکی ہوئی فصل میں کچھ بے چینی کے آثار تھے۔ اب وہ سب ہوری کے پیچھے تیز تیز قدم بڑھانے لگے۔ ہوری پھر چلاّیا۔

''ابے کون ہے رے— بولتا کیوں نہیں— کون فصل کاٹ رہا ہے میری—؟''

مگر کھیت میں سے کوئی جواب نہ ملا۔ اب وہ قریب آ چکے تھے اور کھیت کے دوسرے کونے پر درانتی چلنے کی سڑاپ سڑاپ

© NCERT not to be republished

کی آواز بالکل صاف سنائی دے رہی تھی۔ سب قدرے سہم گئے۔ پھر ہوری نے ہمّت سے للکارا۔

''کون ہے— بولتا کیوں نہیں؟'' اور اپنے ہاتھ میں پکڑی درانتی سُونت لی اچانک کھیت کے پرلے حصّے میں سے ایک ڈھانچہ سا اُبھرا اور جیسے مُسکرا کر انھیں دیکھنے لگا ہو۔

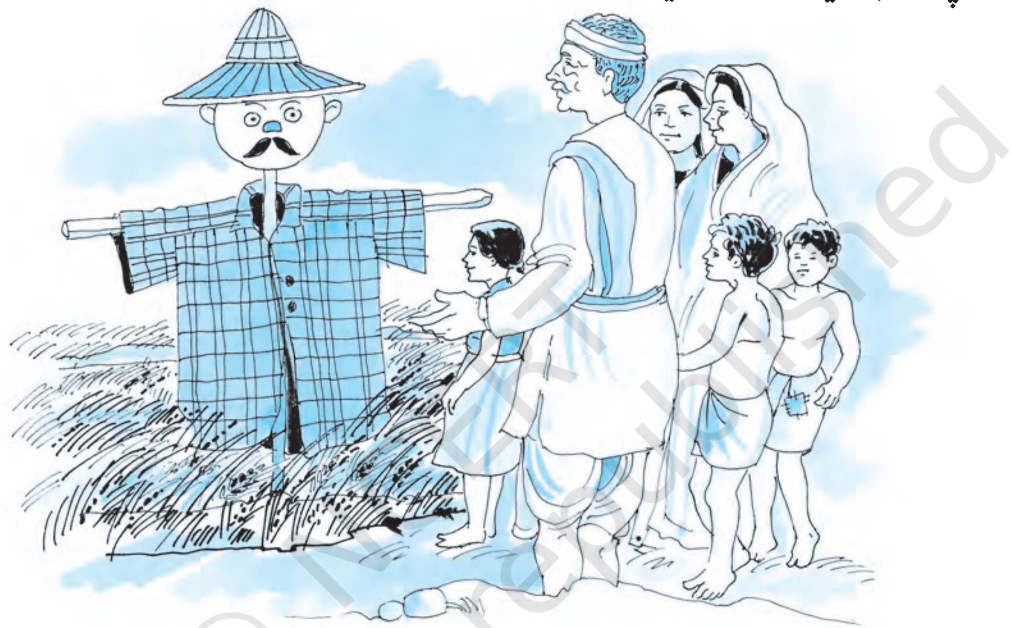

''میں ہوں ہوری کا کا— بجوکا!'' اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی درانتی فضا میں ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

سب کی مارے خوف کے گھُٹی گھُٹی سی چیخ نکل گئی۔ اُن کے رنگ زرد پڑ گئے اور ہوری کے ہونٹوں پر گویا سفید پپڑی سی جم گئی— کچھ دیر کے لیے وہ سب سکتے میں آ گئے اور بالکل خاموش کھڑے رہے— وہ کچھ دیر کتنی تھی؟ ایک پل، ایک صدی یا پھر ایک یُگ—اِس کا اُن میں سے کسی کو اندازہ نہ ہوا۔ جب تک کہ انھوں نے ہوری کی غصّے سے کانپتی ہوئی آواز نہ سنی اُنھیں اپنی زندگی کا احساس نہ ہوا۔

''تم ......بجوکا......تم۔ ارے تم کو تو میں نے کھیت کی نگرانی کے لیے بنایا تھا—بانس کی پھانکوں سے اور تم کو اس انگریز شکاری کے کپڑے پہنائے تھے جس کے شکار میں میرا باپ ہانکا لگاتا تھا اور وہ جاتے ہوئے خوش ہو کر اپنے پھٹے ہوئے خاکی کپڑے میرے باپ کو دے گیا تھا۔ تیرا چہرا میرے گھر کی بے کار ہانڈی سے بنا تھا اور اُس پر اسی انگریز شکاری کا ٹوپا رکھ دیا تھا۔ ارے تو بے جان 'پتلا' میری فصل کاٹ رہا ہے؟''

ہوری کہتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اور بجوکا بدستور اُن کی طرف دیکھتا ہوا مسکرا رہا تھا — جیسے اُس پر ہوری کی کسی بات کا کوئی اثر نہ ہوا ہو۔ جیسے ہی وہ قریب پہنچے اُنھوں نے دیکھا — فصل ایک چوتھائی کے قریب کٹ چکی ہے۔ اور بجوکا اس کے قریب درانتی ہاتھ میں لیے کھڑا مُسکرا رہا ہے۔ وہ سب حیران ہوئے کہ اس کے پاس درانتی کہاں سے آ گئی — وہ کئی مہینوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ بے جان بجوکا دونوں ہاتھوں سے خالی کھڑا رہتا تھا — مگر آج...... وہ آدمی لگ رہا تھا — گوشت پوست کا اُن جیسا آدمی — یہ منظر دیکھ کر ہوری تو جیسے پاگل ہو اُٹھا۔ اس نے آگے بڑھ کر اسے ایک زوردار دھکا دیا — مگر بجوکا تو اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلا البتہ ہوری اپنے ہی زور کی مار کھا کر دور جا گرا — سب لوگ چیختے ہوئے ہوری کی طرف بڑھے۔ وہ اپنی کمر پر ہاتھ رکھے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا — سب نے اُسے سہارا دیا اور اُس نے خوفزدہ ہو کر بجوکا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تو... تو مجھ سے بھی طاقتور ہو چکا ہے بجوکا! مجھ سے...؟ جس نے تمھیں اپنے ہاتھوں سے بنایا — اپنی فصل کی حفاظت کے واسطے۔''

بجوکا حسبِ معمول مسکرا رہا تھا، پھر بولا۔ ''تم خواہ مخواہ خفا ہو رہے ہو ہوری کاکا، میں نے تو صرف اپنے حصّے کی فصل کاٹی ہے۔ ایک چوتھائی —''

''لیکن تم کو کیا حق ہے میرے بچّوں کا حصّہ لینے کا۔ تم کون ہوتے ہو''؟

''میرا حق ہے ہوری کاکا — کیوں کہ میں ہوں — اور میں نے اِس کھیت کی حفاظت کی ہے۔''

''لیکن میں نے تو تمھیں بے جان سمجھ کر یہاں کھڑا کیا تھا اور بے جان چیز کا کوئی حق نہیں ہوتا — یہ تمھارے ہاتھ میں درانتی کہاں سے آ گئی؟''

بجوکا نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ تم بڑے بھولے ہو ہوری کاکا۔ خود ہی مجھ سے باتیں کر رہے ہو — اور پھر مجھ کو بے جان سمجھتے ہو — ؟''

''لیکن تم کو یہ درانتی اور زندگی کس نے دی — ؟ میں نے تو نہیں دی تھی!''

''یہ مجھے آپ سے آپ مل گئی — جس دن تم نے مجھے بنانے کے لیے بانس کی پھانکیں چیری تھیں، انگریز شکاری کے پھٹے پرانے کپڑے لائے تھے، گھر کی بے کار ہانڈی پر میری آنکھیں، ناک، کان اور منھ بنایا تھا — اسی دن ان سب چیزوں میں زندگی کلبلا رہی تھی اور یہ سب مل کر میں بنا اور میں فصل پکنے تک یہاں کھڑا رہا اور ایک درانتی میرے سارے وجود میں سے آہستہ آہستہ نکلتی رہی — اور جب فصل پک گئی وہ درانتی میرے ہاتھ میں تھی لیکن میں نے تمھاری امانت میں خیانت نہیں کی — میں آج کے دن کا انتظار کرتا رہا۔ اور آج جب تم اپنی فصل کاٹنے آئے ہو — میں نے اپنا حصّہ کاٹ لیا، اس میں بگڑنے کی کیا بات ہے؟''

بجوکا نے آہستہ آہستہ سب کہا — تا کہ اُن سب کو اُس کی بات اچھی طرح سمجھ میں آ جائے۔

''نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ یہ سازش ہے۔ میں تمھیں زندہ نہیں مانتا، یہ سب چھلاوا ہے۔ میں پنچایت سے اس کا فیصلہ کراؤں گا۔ تم درانتی پھینک دو۔ میں تمھیں ایک تنکا بھی لے جانے نہیں دوں گا— '' ہوری چیخا، اور بجوکا نے مسکراتے ہوئے درانتی پھینک دی۔

گاؤں کی چوپال پر پنچایت لگی— پنچ اور سرپنچ سب موجود تھے۔ ہوری اپنے پوتے پوتیوں کے ساتھ بیچ میں بیٹھا تھا۔ اُس کا چہرہ مارے غم کے مرجھایا ہوا تھا۔ اس کی دونوں بہوئیں دوسری عورتوں کے ساتھ کھڑی تھیں اور بجوکا کا انتظار تھا۔ آج پنچایت نے (کو) اپنا فیصلہ سُنانا تھا۔ مقدمے کے دونوں فریق اپنا بیان دے چکے تھے۔

آخر دور سے بجوکا خراماں خراماں آتا ہوا دکھائی دیا— سب کی نظریں اُس طرف اُٹھ گئیں۔ وہ ویسے ہی مسکراتا ہوا آرہا تھا۔ جیسے ہی وہ چوپال میں داخل ہوا، سب غیرارادی طور پر اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُن کے سر تعظیماً جھک گئے۔ ہوری یہ تماشہ دیکھ کر تڑپ اُٹھا۔ اُسے لگا جیسے بجوکا نے سارے گاؤں کے لوگوں کا ضمیر خرید لیا ہے، پنچایت کا انصاف خرید لیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو تیز پانی میں بے بس آدمی کی طرح ہاتھ پاؤں مارتا ہوا محسوس کرنے لگا۔

آخر سرپنچ نے اپنا فیصلہ سنایا۔ ہوری کا سارا وجود کانپنے لگا۔ اُس نے پنچایت کے فیصلے کو قبول کرتے ہوئے فصل کا چوتھائی حصہ بجوکا کو دینا منظور کرلیا اور پھر کھڑا ہوکر اپنے پوتوں سے کہنے لگا:

''سنو— یہ شاید ہماری زندگی کی آخری فصل ہے۔ ابھی تھل کھیت سے کچھ دوری پر ہے— میں تمھیں نصیحت کرتا ہوں، اپنی فصل کی حفاظت کے لیے پھر کبھی بجوکا نہ بنانا— اگلے برس جب ہل چلیں گے— بیج بویا جائے گا اور بارش کا امرت کھیت میں سے کونپلوں کو جنم دے گا— تو مجھے ایک بانس پر باندھ کر کھیت میں کھڑا کردینا— بجوکا کی جگہ پر۔ میں تب تک تمھاری فصلوں کی حفاظت کروں گا۔ جب تک تھل آگے بڑھ کر کھیت کی مٹی کو نگل نہیں لے گا اور تمھارے کھیتوں کی مٹی بھربھری نہیں ہوجائے گی۔ مجھے وہاں سے ہٹانا نہیں— وہیں رہنے دینا— تاکہ جب لوگ دیکھیں تو انھیں یاد آئے کہ بجوکا نہیں بنانا۔ کہ بجوکا بے جان نہیں ہوتا— آپ سے آپ اُسے زندگی مل جاتی ہے اور اُس کا وجود اُسے درانتی تھمادیتا ہے اور اُس کا فصل کی ایک چوتھائی پر حق ہوجاتا ہے۔''

ہوری نے کہا اور پھر آہستہ آہستہ اپنے کھیت کی طرف بڑھا۔ اُس کے پوتے اور پوتیاں اُس کے پیچھے تھے اور پھر اس کی بہوئیں اور ان کے پیچھے گاؤں کے دوسرے لوگ سر جھکائے ہوئے چل رہے تھے۔

کھیت کے قریب پہنچ کر ہوری گرا اور ختم ہوگیا۔ اُس کے پوتے، پوتیوں نے اُسے ایک بانس سے باندھنا شروع کیا— اور باقی کے سب لوگ یہ تماشہ دیکھتے رہے— بجوکا نے اپنے سر پر رکھا شکاری ٹوپا اُتار کر سینے کے ساتھ لگالیا اور اپنا سر جھُکا دیا۔

(سریندر پرکاش)

مشق

لفظ و معنی

بجوکا	:	بانس یا درخت کی شاخوں سے بنا ہوا ایک ڈھانچا جسے ٹوپی اور قمیض یا کرتا پہنا کر کھیت میں آدمی کی طرح کھڑا کردیتے ہیں۔ اُس سے ڈر کر دن میں چڑیاں اور رات کو گیدڑ وغیرہ کھیت سے دور رہتے ہیں۔ بعض جگہ کسان اسے ''دھوکا'' بھی کہتے ہیں۔
خم پڑنا	:	جھک جانا
اثنا	:	دوران، بیچ
وجود	:	ہستی، مراد سماجی حیثیت
پرورش کا بار	:	پالنے پوسنے کی ذمّے داری
خون کی گردش	:	رگوں میں خون کا دوران
پنڈا	:	بدن، جسم
چنگیری	:	روٹیاں رکھنے کی ڈلیا
تن دہی	:	پھرتی، مستعدی
اہلمد	:	(صحیح لفظ: اہلِ مد) عدالت میں پیشکار کا محرّر
بیر (ویر)	:	بہادر
بیر بجرنگی	:	ہنومان جی کا ایک لقب
جھونا	:	سونا کے ساتھ بہ طور تابعِ مہمل استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً: خدا سونا جھونا پہننا نصیب کرے۔ یہاں مراد ہے: بالیوں میں اناج کے سونے جیسے دانے
تھل	:	ریگستان
بدستور	:	پہلے کی طرح
چھلاوا	:	دھوکا، سایہ جو دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہوجائے

© NCERT not to be republished

غور کرنے کی بات

- پریم چند کے ناول ''گئودان'' کا مرکزی کردار ہوری، ایک غریب کسان ہے جس کی زندگی طرح طرح کی پریشانیوں میں گزری اور ناول کے اختتام پر اُس کی موت واقع ہوگئی۔ناول'' گئودان''1936 میں شائع ہوا اور ''بجوکا'' کے لکھے جانے کی تاریخ 20 اکتوبر 1977 ہے جس میں ہوری کو زندہ دکھایا گیا ہے۔
- ناول اور افسانے کے زمانۂ اشاعت پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقریباً چالیس برس کی اس مدّت کو سریندر پرکاش نے افسانے کا پس منظر بنایا ہے۔ یہ پس منظر، افسانے میں موجود ہوتے ہوئے بھی بیک نظر دکھائی نہیں دیتا کیونکہ افسانہ نگار نے اس کا بیان بہت لطیف انداز سے کیا ہے۔
- اس افسانے میں مصنّف ہر موقعے پر غیر جانب دار رہا ہے۔یعنی ہر واقعے کا بیان انتہائی غیر جذباتی انداز میں کیا ہے اور اپنی رائے پوشیدہ رکھی ہے۔اس رویّے سے افسانے کے معنی میں وسعت پیدا ہوگئی ہے۔ یہ عمل فنّی نقطۂ نظر سے نہایت اعلیٰ سمجھا جاتا ہے۔
- افسانے کے اختتام کے قریب یہ طویل پیرا گراف :

''سنو— یہ شاید ہماری زندگی ... حق ہوجاتا ہے۔''

ایک وصیت جیسا ہے۔ اِس میں کہی گئی باتوں کا مطلب یہ ہے کہ افراد ہوں یا قومیں، اُنھیں اپنی املاک اور پیداوار وغیرہ کی حفاظت خود ہی کرنی چاہیے۔ یہ کام اگر وہ دوسروں کو سونپ دیں گے تو ایک دن ایسا آ سکتا ہے کہ تحفّظ کے بے جان ذمّے داروں میں بھی اُس املاک یا پیداوار میں سے اپنا حصّہ لینے کی قوّت پیدا ہوجائے— وہ قوت کس طور پیدا ہوگی؟ اِس سوال کا پورا پورا جواب تو آنے والا وقت ہی دے گا۔ جواب کی ایک جھلک افسانے میں ہے کہ محنت کا پھل ہوری کو ملتا ہے تو بجوکا بھی اپنی محنت کا پھل پانے کا حقدار ہے۔

سوالات

1. 'ہوری' کون ہے اور وہ پریم چند کے کس ناول سے تعلق رکھتا ہے؟
2. فصل پک جانے پر 'ہوری' خوش کیوں تھا؟

3. 'بجوکا' کسے کہتے ہیں؟ افسانہ نگار نے اس کے ذریعے کیا پیغام دیا ہے؟
4. 'ہوری' نے اپنے گھر والوں کو کیا وصیت کی تھی؟

عملی کام

- افسانے کا خلاصہ لکھیے۔

© NCERT not to be republished

اقبال مجید

1934

اقبال مجید ضلع سیتاپور (اُتر پردیش) میں پیدا ہوئے۔ ایم۔اے لکھنؤ یونیورسٹی سے کیا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد کچھ عرصے تک اسکول میں پڑھاتے رہے اس کے بعد آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہوگئے۔ ملازمت کے دوران انھیں کئی شہروں میں رہنا پڑا۔ مالوہ کی پُرفضا سرزمین بھوپال اُن کی ملازمت کا آخری پڑاؤ تھا، جہاں وہ اسسٹینٹ اسٹیشن ڈائریکٹر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ بالآخر بھوپال ہی میں انھوں نے مستقل سکونت بھی اختیار کر لی۔

اقبال مجید، عہدِ جدید کے ایک نامور افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے کئی اعلیٰ درجے کے ڈرامے بھی لکھے ہیں۔ ''نمک'' اور ''کسی دن''، ان کے دو ناول ہیں۔ ''دو بھیگے ہوئے لوگ''، ''ایک حلفیہ بیان''، ''شہرِ بدنصیب'' اور ''تماشا گھر'' ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔ اقبال مجید کا تعلق اس نسل سے ہے جو 1955-60 کے بعد پروان چڑھی۔ اقبال مجید نے نئے طرز کے کئی افسانے بھی لکھے ہیں جن میں آج کے انسان کی داخلی اور روحانی الجھنوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ افسانوی تکنیک میں بھی انھوں نے بعض اہم تجربے کیے ہیں۔ تاہم کہانی میں کہانی پن کے عنصر کو انھوں نے برقرار رکھا۔ اقبال مجید نے اپنے افسانوں، ڈراموں اور ناولوں میں سیاسی و سماجی شعور کے ساتھ ساتھ نفسیاتی بصیرت سے بھی بخوبی کام لیا ہے۔ جدید اردو افسانے کی تاریخ میں اقبال مجید کا ایک نمایاں مقام ہے۔

© NCERT not to be republished

5257CH08

سکون کی نیند

میرے بزرگوں کا پیشہ داستان گوئی تھا۔ میں بھی اپنا پیٹ پالنے کے لیے یہ پیشہ اختیار کر چکا ہوں۔

میری ایک وقت کی روٹی کا انتظام ہو جائے، بس اس امید پر میں آپ کو ایک دل چسپ داستان سنا رہا ہوں۔

تو شروع کرتا ہوں نام لے کر اس خدا کا، جس نے یہ دنیا بنائی۔ اُسی خدا کی خدائی میں ایک ملک تھا کہ نام تھا جس کا ملکِ ہوا، کیونکہ وہاں کے باسی ہواؤں سے ہی اپنی ضرورت پوری کیا کرتے تھے۔ اُس ملکِ ہوا کا بادشاہ جب مرنے لگا تو اپنے جوان بیٹے کو یہ وصیت کی کہ بیٹا اپنے محل کے سارے کمرے کھولنا مگر وہ تالا کبھی نہ کھولنا جو ایک سرنگ کے دروازے پر لگا ہے، کیونکہ اس سرنگ میں آگ، پانی، مٹی اور ہوا ایک ساتھ قید ہیں اور یہ ایک ایسا عجوبہ ہے جو ملکِ ہوا کے باشندوں کی عقل وفہم سے باہر ہے۔

بادشاہ کی موت کے بعد نوجوان شہزادے کے دل میں اس سرنگ کا راز جاننے کی بے چینی ایسی بڑھی کہ تالا کھول سرنگ کے اندر قدم رکھ دیا اور پہنچ گیا ایسی دنیا میں جہاں دو طرح کے انسان پائے جاتے تھے۔ ایک وہ جو جی رہے تھے اور دوسرے وہ جو جیتے جی مر رہے تھے......سبب معلوم کرنے پر اسے پتہ چلا کہ اس ملک میں وہی جی سکتا تھا جس کے پاس وافر مقدار میں پیسہ تھا، کیونکہ وہاں ہواؤں کے بجائے ساری ضرورتیں پیسے سے ہی پوری کی جاتی تھیں۔

شہزادے نے دعائیں پڑھیں اور ہواؤں کی دیوی کو آواز دی۔ دیوی آئی تو شہزادے نے اس ملک کی پریشان حال جنتا کا احوال بتایا اور منّت کی کہ وہ ان سب کو پیسے سے مالا مال کر دے تا کہ سب آرام اور سکون سے رہ سکیں۔ دیوی نے شہزادے کی سفارش پر ایسا ہی کیا۔ پھر تو دوسرے ہی دن سے اس ملک کے مرد و زن، بوڑھے اور بچے جب سو کر اٹھتے تو دیکھتے کہ ان کے تکیے کے نیچے دو لاکھ روپے رکھے ہوئے ہیں۔

پہلے تو ان نوٹوں کو نقلی سمجھا گیا، لیکن جب سرکار نے یہ اعلان کیا کہ وہ سب ہی نوٹ اصلی ہیں، کیونکہ ان نوٹوں کے بدلے میں سرکار کے خزانے میں اتنا سونا بھی روز بروز بڑھتا جا رہا ہے، تو بہت سوں کا مارے خوشی کے ہارٹ فیل ہو گیا۔

جو پہلے سے کروڑ پتی اور ارب پتی تھے اُن کی سب سے بڑی پریشانی مزدور تھا، جو آنکھ میں لگانے کو بھی نہ ملتا تھا۔ کارخانے

© NCERT not to be republished

بند ہونا شروع ہوگئے تو دوسرے ملکوں نے اپنا ردّی سامان پہنچانا شروع کردیا۔ ملک کے بڑے بڑے انجینئر، سائنٹسٹ، ٹیکنوکریٹ کوڑی کے تین ہوگئے۔ باہر کے ملکوں نے جب تجارت کے نام پر دھاندلی شروع کردی اور ایک ہزار روپے میں ایک ماچس بیچنا شروع کردی تو حکومت بوکھلا گئی لیکن اس دن تو حکومت کے ہاتھوں کے طوطے ہی اُڑ گئے، جب اسے معلوم ہوا کہ ملک کے کسان اپنی دولت چپکے چپکے دوسرے ملکوں کے بینکوں میں جمع کر کے، کھسکتے جارہے ہیں اور فصل اگانا توہین آمیز کام سمجھنے لگے ہیں۔

یہ دیکھ کر حکومت نے اپنے سارے اعلیٰ دماغوں کو یکجا کیا۔ بڑے بڑے سیمنار کیے۔ سوال یہ تھا کہ کیا ملک کے سو فیصدی لوگ ایک ساتھ ایک جیسے مالدار ہوسکتے ہیں۔ کیا سب کو مالدار ہوجانے دیا جائے؟ جواب ملا۔ نہیں۔ ایسا کبھی نہ ہونا چاہیے۔

© NCERT not to be republished

بڑے بحث مباحثے کے بعد یہ پتہ چلا کہ مالدار ہونے کی یہ بیماری اس لیے ہے کہ لوگ رات کو سوتے ہیں اور سویرے اٹھ کر تکیہ ہٹاتے ہیں تو روز دو لاکھ پاتے ہیں۔ اس بات پر جب اور تحقیق کی گئی تو پتہ چلا کہ دیوی نے یہ شرط لگائی تھی کہ جو صبح سو کر اٹھے گا اس کے تکیے کے نیچے سے یہ دولت نکلے گی۔ اس کی تصدیق کے لیے حکومت نے تجربے کے طور پر کچھ لوگوں کو ایک رات جگائے رکھا اور صبح ہونے پر سوئے بغیر ان لوگوں نے جب اپنے تکیے کو ہٹایا تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ یہ دیکھ کر حکومت کو کافی تسلّی ہوئی۔ اس نے ملک کے چوٹی کے سائنٹسٹوں کو جمع کیا اور ان کے سامنے یہ مسئلہ رکھا کہ اگر اس ملک کو تباہی سے بچانا ہے تو ملک

میں دولت کی اس بیہودہ تقسیم کوختم کرنا ہی ہوگا۔دولت تو کمانے کی چیز ہے جو پڑی مل جائے اور وہ بھی ایک ہی وقت میں سب کو مل جائے اسے خدا کا عذاب کہا جائے گا، دولت نہیں۔سائنس دانوں نے اس سلسلے میں حکومت کے خیال کی تائید کی تو طے پایا کہ کوئی ایسی دوا ایجاد کی جائے جولوگوں کی راتوں کی نیند چھین لے۔ بڑی عرق ریزی کے بعد سائنس دانوں نے ایک ایسا انجکشن تیار کیا جس کے لگانے سے آدمی کومہینوں نیند نہ آئے۔ان انجکشنوں کو سرکاری اسپتالوں میں گلوکوز کے نام سے پہنچایا گیا۔ جہاں ہزاروں شہریوں کوسرکاری کارندے روز پکڑ کر لاتے اور انھیں یہ گلوکوز چڑھادیا جاتا۔دیکھتے ہی دیکھتے اُس ملک کی آدھی سے زیادہ آبادی نے رات کوسونا چھوڑ دیا اور وہ کچھ ہی دنوں میں کنگال ہوگئی۔ یہ آبادی راتوں کو جاگتی تھی اور دن بھر اپنی مفلسی پر آہیں بھرتی تھی۔

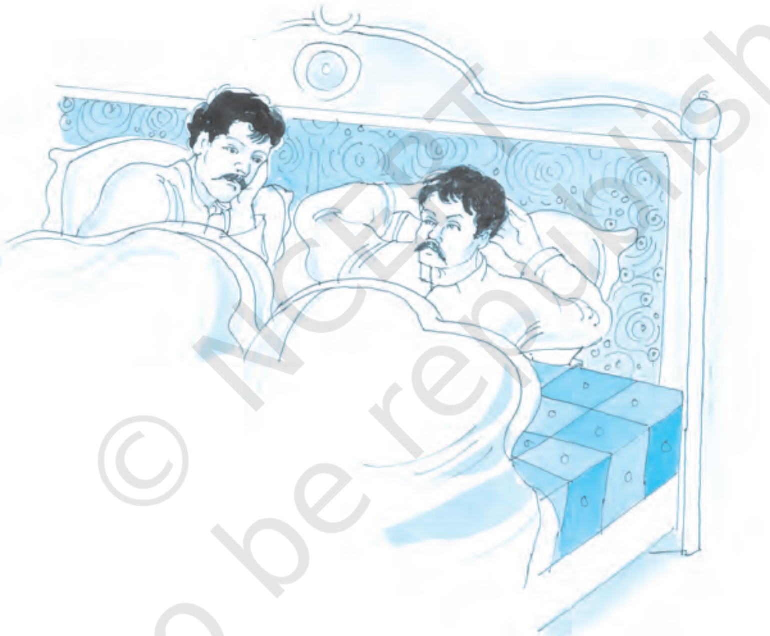

سائنس دانوں کی مدد سے جب حکومت نے ایک خاصا بڑانادارمفلس طبقہ تیار کرلیا تو اپنی اس کامیابی پر وہ بے حدخوش ہوئی۔حکومت کے لوگ آرام سے سوتے تھے اور سویرے دولاکھ پاتے تھے۔اس خیال نے کہ وہ جب چاہیں کسی کو بھی ایک انجکشن لگاکر اس کی کمائی بند کرسکتے ہیں اور اسے پیسے پیسے کا محتاج کرسکتے ہیں انھیں فرعون بنا دیا۔تب ہی انھیں پتہ چلا کہ جوانجکشن انھوں نے ایجاد کیا تھا اور جس کے سبب ملک کی آدھی سے زیادہ آبادی راتوں کی نیند کھوچکی تھی، اُس آبادی کے لوگوں کے خون میں اس دوانے کچھ ایسے اثرات پیدا کردیے ہیں کہ اگر وہ کسی کو کاٹ لیں تو وہ انسان تڑپے بغیر ختم ہوجایا کرتا ہے۔کچھ دنوں بعد ان امیروں کو یہ انکشاف ہوا کہ وہ زہریلے لوگ کھڑکیوں اور روشن دانوں کے راستے خواب گاہوں میں گھستے ہیں اور سوتے ہوئے آدمی

© NCERT not to be republished

کو کاٹ کر چلے جاتے ہیں۔اس انکشاف نے روز دولا کھ کمانے والوں کی نیندیں کیسے غائب کیں اور کس طرح وہ سارے کے سارے ارب پتی اس خوف سے پریشان ہوکر کہ رات کو کوئی نادار اُنھیں کاٹ نہ لے اور وہ سوتے کے سوتے ہی رہ جائیں، اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے بازوؤں میں شب بیداری کا وہ انجکشن لگانے لگے۔بہرحال اس داستان کا انجام یہ ہے کہ برسوں بعد جب اُس شہزادے کا اس ملک کی جانب سے گزر ہوا، تو اس نے دیکھا کہ اس ملک کے باسی خدا سے یہ دُعا مانگ رہے تھے کہ اے خدا تو ہم سے ہمارا سب کچھ لے لے اور اس کے بدلے ہمیں دو پل سکون سے سو لینے کی نیند دے دے۔

(اقبال مجید)

مشق

لفظ و معنی

داستان	:	قصّہ، کہانی، کہانیوں کا ایک طویل سلسلہ
داستان گو	:	قصّہ سنانے والا، وہ شخص جو قصّہ سنانے کا پیشہ اختیار کرے
باسی	:	باشندے
وصیت	:	سفر کے لیے روانہ ہونے سے پہلے یا مرنے سے پہلے اپنے پس ماندگان یا متعلقین کو دی جانے والی ہدایات، آخری نصیحت
عجوبہ	:	حیرت میں ڈالنے والی چیز، انوکھی چیز
وافر	:	بہت زیادہ
سائنٹسٹ	:	سائنس داں
ٹیکنوکریٹ	:	تکنیک کا ماہر (انجینیر)
توہین آمیز	:	ذلّت سے بھرا ہوا

© NCERT not to be republished

سیمنار	:	کسی علمی، ادبی موضوع پر مذاکرہ یا مباحثہ
تحقیق	:	تلاش و جستجو، حقیقت کی چھان بین
تصدیق	:	سچ ہونے کی تائید، ثبوت
عرق ریزی	:	محنت ومشقّت، کسی کام کو بہت لگن سے انجام دینا اور اس کے لیے محنت کرنا
نادار	:	غریب، مفلس
انکشاف ہونا	:	ظاہر ہونا، کھُلنا
خواب گاہ	:	سونے کا کمرہ
شب بیداری	:	راتوں کو جاگنا

غور کرنے کی بات

- کسی کے پاس دولت کا نہ ہونا اتنا بڑا عذاب نہیں ہے، جتنا دولت کا بے حساب ہونا۔ انسان جب دولت کے نشے میں سرشار ہوتا ہے تو وہ فطرت کی نعمتوں ہی سے دور نہیں ہوجاتا بلکہ خودغرض بھی ہوجاتا ہے۔ حسن اخلاق سے اسے کوئی مطلب ہوتا ہے اور نہ عام انسانی ہمدردی ہی اس کے لیے کوئی معنی رکھتی ہے۔ سب سے بڑی چیز جس سے وہ محروم ہوتا چلا جاتا ہے، وہ راتوں کی نینداور دل کا سکون ہے۔ ان چیزوں کو پانے کے لیے وہ نیند کی گولیوں اور انجکشن کے استعمال پر مجبور ہوتا ہے۔ اس افسانے میں افسانہ نگار نے انجکشنوں کے منفی اثرات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ یہ سونے والے جب کسی انسان کو کاٹ لیا کرتے تھے تو وہ بغیر تڑپے مرجاتا تھا، دولت مند ایسے لوگوں سے پناہ مانگنے لگے اور پل دو پل کی نیند کے لیے خدا سے دعا مانگنے لگے۔

سوالات

1. شہزادے نے 'ملکِ ہوا' میں کیا دیکھا؟
2. شہزادے نے ہوا کی دیوی سے کیا سفارش کی؟

3. دو دو لاکھ روپے ملنے کے بعد لوگوں کے طرزِ زندگی میں کیا فرق پیدا ہوا؟
4. سائنس دانوں نے کیا دوا ایجاد کی اور کیوں؟
5. لوگوں پر نیند کے انجکشن کا کیا اثر ہوا؟
6. دولت مندوں نے آخر میں خدا سے کیا دعا مانگی؟

عملی کام

- آزادی کے بعد لکھے جانے والے کم سے کم پانچ افسانے پڑھیے اور یہ بتائیے کہ ان میں کس قسم کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔

© NCERT not to be republished

شفیع جاوید

1935

شفیع جاوید، صوبۂ بہار کے شہر مظفّر پور میں پیدا ہوئے۔ گھر کا ماحول ادبی تھا۔ آبائی وطن تاریخی شہر ''گیا'' ہے جسے مہاتما بدھ سے تعلّق کی بنیاد پر شہرت ملی۔ انھوں نے پٹنہ یونیورسٹی سے سماجیات میں ایم۔ اے کیا۔ محکمۂ اطلاعات ونشریات، حکومتِ بہار کے ڈائریکٹر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے۔ اب پٹنہ میں مقیم ہیں۔ شفیع جاوید کا پہلا افسانہ ''آرٹ اور تمباکو'' 1953 میں شائع ہوا۔ اُن کے افسانوں کے مجموعے ہیں: ''دائرے سے باہر'' (1979)، ''کھلی جو آنکھ'' (1982)، ''تعریف اُس خدا کی'' (1984) ''وقت کے اسیر'' (1991) اور ''رات اور میں'' (2004)۔ ''تیز ہوا کا شور''، ''کہاں ہے ارضِ وفا''، ''حکایتِ ناتمام''، ''بھولے بِسرے گیت''، ''منزل''، ''اجنبی''، ''کاغذ کی ناؤ'' وغیرہ اُن کے مشہور افسانے ہیں۔

شفیع جاوید کے افسانوں میں ماضی کی یادیں، عصرِ حاضر کے ساتھ گھل مل کر ایک فلسفیانہ رنگ پیدا کرتی ہیں۔ اظہار کی اشاریت کو ان کے افسانوں میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اپنی فضا بندی اور ایک ہلکی رومانوی لہر کے باعث شفیع جاوید کے افسانے امتیازی تاثّر پیدا کرتے ہیں۔ شفیع جاوید اپنی زبان اور احساس وفکر کے لحاظ سے ایک منفرد افسانہ نگار ہیں۔

© NCERT not to be republished

5257CH09

میں، وہ

وہ ضعیف آدمی آج بھی پلیٹ فارم پر صبح اسی وقت آیا جیسے وہ روز آیا کرتا ہے۔ اس کی چال بھی ایک ہی طرح کی ہوتی ہے۔ ویسے ہی آگے کی طرف اس کا جسم جھُکا ہوا، ہلکا سا خَم کھایا ہوا، داہنا کاندھا کچھ نیچا اور بایاں ہاتھ کبھی سیدھا کبھی کمر پر رکھا ہوا، یہاں پھلواری شریف کے اسٹیشن پر اپنی تجسّس بھری آنکھوں کے ساتھ آتا ہے۔ پہلے نمبر کے پلیٹ فارم پر جو خاصا لمبا ہے، دھیرے دھیرے چلتے ہوئے ایک دم آخری سرے سے پہلے ایک بنچ پر بیٹھ جاتا ہے اور پٹنہ جنکشن کی طرف دیکھتا ہے۔

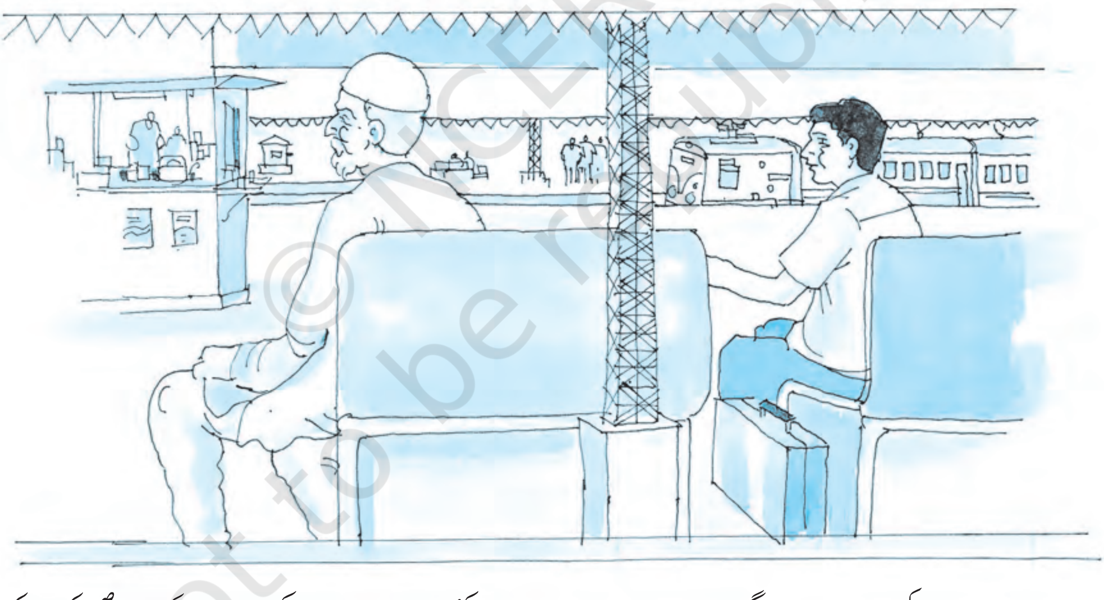

شاید اسے کسی کا انتظار ہے، مگر ہر روز ......؟ میں سوچتا ہوں اور کئی دن سے یہ منظر دیکھتا ہوں۔ ڈاکٹر نے صبح کی سیر کی پابندی لگا دی ہے اور شام کو سڑک ناپنے کی پابندی اختر نے لگا دی ہے۔ جب سے اس ریلوے اسٹیشن کی حسن کاری ہوئی ہے، میں بھی دوسروں کی طرح صبح کو ادھر ہی آجاتا ہوں۔ اب صبح کے وقت بہت لوگ آجاتے ہیں۔ مردوں، عورتوں اور بچّوں کا ہجوم ہوتا

© NCERT not to be republished

ہے، بہت چہل پہل رہتی ہے۔ پتہ نہیں، یہ ضعیف آدمی یہاں کب سے آتا ہے۔ صبح کی سیر تو اس کا مقصد نہیں معلوم ہوتا کیونکہ یہ آکر اسی بنچ کے اسی ایک گوشے میں بیٹھ جاتا ہے۔ اپنی چپّل سے ایک پاؤں نکال کر دوسرے پاؤں کے گھٹنے پر رکھ کر ماتھے کا پسینہ رومال سے پونچھتا ہے۔ پھر اپنے کسی ایک ہاتھ پر ٹھوڑی لگا کر بڑے گمبھیر اور انٹل ایکچول انداز میں دیکھتا ہے، کہیں بہت دور۔ سیر کر لینے کے بعد میں جب تھک جاتا ہوں تو اس سے کچھ دوٗر والی بنچ پر بیٹھ کر اخبار پڑھنے لگتا ہوں اور کبھی کبھی اپنی گردن گھما کر اسے دیکھ بھی لیتا ہوں۔ وہ میری طرف کبھی نہیں دیکھتا۔ یا تو وہ سامنے دیکھتا ہے یا پھر پٹنہ جنکشن کی طرف جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔ لیکن صبح کی ساری گاڑیاں جب پچھّم کی طرف نکل جاتی ہیں تو کچھ دیر تک بیٹھے رہنے کے بعد وہ اٹھتا ہے اور آہستہ قدم چل کر بے حد تھکی سی آواز میں پان والے سے پوچھتا ہے۔

''آرہ کے لیے ٹرین کب آئے گی؟''

پان والا ہنس دیتا ہے اور روز کی طرح کہتا ہے: ''بابا وہ تو گئی۔''

''کب چلی گئی لیکن میں تو یہیں بیٹھا انتظار کر رہا تھا۔''

پان والا اس کی بات کا اب کوئی جواب نہیں دیتا ہے۔

وہ پھر پوچھتا ہے'' آرہ والی ٹرین ......؟''

''اب کل آنا بابا۔'' وہ کچھ اُکتائی ہوئی آواز میں جواب دیتا ہے لیکن اسکی آواز میں شاید تھوڑا سا ترحّم بھی ہے، یا شاید مجھے ہی ایسا لگ رہا ہے۔

آج بھی وہ کونے والے بنچ پر آکر بیٹھ گیا ہے اور میں بھی تھک جانے کے بعد اخبار پڑھنے لگا ہوں۔ ہوا خوشگوار ہے اور املتاس کے پھولوں کا سایہ ہم دونوں کے سروں پر ہے۔ خبروں میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ میں تھوڑی ہی دیر میں اوٗب کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اسی وقت ڈی لکس دھڑ دھڑاتی ہوئی گزر گئی، بہت تیز رفتاری سے۔ اسے لمبا سفر جو طے کرنا تھا۔ دلّی سے ہوڑہ تک لمبے سفر کے لیے تیز رفتاری تو ضروری ہی ہے۔ اس کے بعد راجدھانی، شاہی ٹرین کی اپنی ہی شان تھی۔ بوڑھے آدمی نے اپنی گھڑی دیکھی۔ میں نے اس کی بنچ کے قریب جا کر کہا۔

''آج راجدھانی لیٹ ہے بابا۔''

''اب راجدھانی بھی ...'' بوڑھے آدمی نے پہلی بار مجھے مسکرا کر دیکھا۔ اس کی مسکراہٹ کچھ اُس سے بھی زیادہ بوڑھی معلوم ہوتی تھی۔

© NCERT not to be republished

''ہوتا ہے بابا، ایسا بھی ہوتا ہے۔''

ہماری بات ختم نہ ہو پائی تھی کہ سمپورن کرانتی آ گئی اور اس چھوٹے سے اسٹیشن پر خدا معلوم کیوں رُک گئی۔

''اسے کیا ہوا جو یہاں ...؟''

''آگے پٹنہ جنکشن پر پلیٹ فارم خالی نہ ہوگا۔''

''تمھیں ان ٹرینوں کی بہت واقفیت ہے''۔ وہ پھر مسکرایا، اس بار اس کی مسکراہٹ اور آواز اچھّی لگی۔

''بہت تو نہیں بابا، بس تھوڑی سی کام چلاؤ معلومات رکھتا ہوں۔''

میں بھی اسی بنچ پر بیٹھ گیا۔ سمپورن کرانتی کے مسافروں نے آئس کریم، پان، سگریٹ اور ناشتے کی کچوریوں والوں کو خوب نوازا۔ وہ ضعیف آدمی مسکراتا رہا اور میں اسے غور سے دیکھتا رہا۔ اس کے سفید بالوں میں اب تک لہریں باقی تھیں، گھنے سر کے بال، بچوں جیسے اس کے بے داغ چہرے پر اس کے سانولے پس منظر میں اچھے لگ رہے تھے۔ میں نے سوچا، ''یہ شخص خوبصورت رہا ہوگا۔''

''کیا سوچتے ہو بیٹا؟'' اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

''سوچ رہا تھا بابا کہ آپ کس کے لیے آتے ہیں؟''

''میں''

''ہاں''

''میں اپنے آپ کے لیے آتا ہوں۔'' وہ ٹھنڈی سی آواز میں بولا۔

''میں سمجھا نہیں''

''ایک وقت ایسا بھی آتا ہے بیٹا۔ سمجھ لوگے جب تم پر ایسا وقت کبھی آئے گا۔ میں تو جیون کا تیرتھ یاتری ہوں لیکن شاید جہاں پہنچنا تھا، وہاں پہنچ نہیں پایا، شاید راستہ بھٹک گیا، لیکن انتر آتما وہی ہے۔ یاتری کی انتر آتما۔''

''بابا پھر بھی میں سمجھا نہیں۔''

''تم نے زندگی کہاں دیکھی ہے بیٹا، تم کیا سمجھ پاؤ گے؟ یہ باتیں سمجھانے کی نہیں۔''

''نہیں خوب دیکھی ہے میں نے زندگی، اس جیون کے مہابھارت میں بڑا سنگھرش رہا ہے۔'' میں نے طاقت بھری آواز میں کہا۔

''بیٹا تم نے تپتی دوپہر میں چٹیل سڑک کے کنارے سائکل کا پنکچر بنوایا ہے کبھی؟''

''بابا وہ بات دراصل یہ ہے......'' میں بوڑھے کے اس اچانک حملے سے گڑبڑا سا گیا۔

’’تم مجھ کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ تمھارے پاس کچھ چھوٹ جانے کی یادیں نہیں ہیں۔ بچھڑے ہوئے چہروں کی ریکھائیں تمھاری آنکھوں میں نہیں ہیں۔ تم نے لالٹین کے شیشے کو راکھ سے صاف کر کے، گرم تپتی ہوئی زمین پر جوٹ کا بورا بچھا کر بیٹھے ہوئے اور لیٹے ہوئے، نیند کو نہ جاننے والی آنکھوں سے، سلیٹ پر چکرورتی کے حساب نہیں لگائے ہیں، لالٹین کے ٹوٹے شیشے کو پرانے پوسٹ کارڈ چپکا کر جوڑنے کا کشٹ کبھی نہیں جھیلا ہوگا ......‘‘

لمبی سانس لیتے ہوئے وہ بوڑھا لمحے بھر کو رُکا۔ میں کچھ کہنے والا تھا کہ وہ پھر بولنے لگا۔

’’تم نے معصوم، بے غرض، بے ریا لوگوں کو نہیں دیکھا۔ بجلی آنے سے پہلے کی شانتی نہیں دیکھی، تم تو Babylonian جلاوطنوں جیسی زندگی گزارتے ہو اور دل کی دنیا کے شرنارتھی ہو...‘‘ اس کو کھانسی آ گئی، لیکن وہ اسی کھانسی میں بولتا گیا۔

’’تم نے اعصاب زدہ زندگیاں گزاری ہیں۔ تمھیں کیا پتہ، آدمی کیا ہوتا ہے؟ دور سے آنے والی ہواؤں کی خوشبو کیا ہوتی ہے؟ انتظار کیا ہوتا ہے؟ تمھیں تو محسوس کرنے اور گنگنانے کی فرصت بھی نہیں...‘‘

’’دنیا سب کا خون پی جاتی ہے۔‘‘ میں نے کہنا چاہا، لیکن الفاظ میرے دل ہی میں رہ گئے۔

’’بیٹا! ایسا تمھارے ساتھ کبھی ہوا ہے کہ پانی کوئی دوسرا پیے اور پیاس تمھاری مٹ جائے؟‘‘

’’نہیں، ایسا کبھی ہوتا بھی ہے کیا؟‘‘ میں نے کچھ چڑ کر پوچھا۔

’’نہ سمجھ پاؤ گے ابھی...‘‘ ہم دونوں کچھ دیر کے لیے چُپ ہو گئے۔ پھر میں نے ہمّت کر کے پوچھ لیا۔

آپ کون ہیں بابا؟‘‘

بوڑھے کی پیشانی پھر شکن آلود ہوگئی۔

’’وہ عہد و پیماں کے جزیرے جہاں محبت کی فصلیں اُگتی تھیں، تمھارے لائے ہوئے زہر کے سمندر میں ڈوب گئے۔ اب تم مجھ سے پوچھتے ہو کہ میں کون ہوں؟ دل کا دروازہ بند ہو جاتا ہے تو لوگوں کی پہچان بھی بند ہو جاتی ہے۔‘‘

کس قدر جھکّی اور چڑچڑا ہے یہ بوڑھا، میں نے دل میں کہا اور چُپ ہو رہا لیکن چلنے سے پہلے ہمّت کر کے میں نے پوچھ ہی لیا۔ ’’بابا آپ کرتے کیا ہیں؟‘‘

’’میرا کیا پوچھتے ہو؟ خوش ہوں کہ دوسرے خوش ہیں۔ بھیڑ میں تنہا۔ پہلے تماشا دیکھتا تھا، اب خود تماشا ہوں، بلّوریں شیشے میں مقید مچھلی دیکھی ہے تم نے؟‘‘

’’جی ہاں‘‘

''وہ مچھلی کھاتی پیتی ہے ۔ ہر وقت تیرتی پھرتی ہے، سب اسے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں لیکن مچھلی تو شیشے کی دیوار کے اندر ہے۔ اسے بھلا کچھ نظر آتا ہوگا؟ اپنے کمرے کی راکنگ چیئر پر میں تھکا ہوا، مقید، کچھ کر گزرنے کی خواہش پر اب کچھ نہ کرنے کی خواہش چھا گئی ہے۔ وہاں بیٹھا بیٹھا چپ چاپ جتنی دنیا دکھائی دیتی ہے، دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں......اب موت نہیں زندگی مایوس کرتی ہے۔'' وہ اٹھ کر آہستہ قدم چلنے لگا؟ وہ میرے ساتھ یا میں ہی اس کے ساتھ چلتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ہمارے سائے ایک ہوگئے۔ اس وقت اگر نزدیک سے بھی کوئی ہمیں دیکھتا تو اسے ہم دونوں ایک ہی لگتے۔ بہت وقت گزر گیا تھا۔

ایک ضعیف آدمی آج بھی اسی پلیٹ فارم پر صبح اسی وقت آیا ہے اور دور کی بنچ پر اسی طرح ایک کونے میں بیٹھ گیا ہے۔ املتاس کے پھول بھی اسی رنگ میں اوپر کھلے ہوئے ہیں۔ گاڑیاں آج بھی یوں ہی آ اور جا رہی ہیں۔ راجدھانی، ڈی لکس، شرم جیوی، سمپورن کرانتی ......خوش دلی کے شب و روز کے سبز جزیرے جنھیں زہر کے سمندر کے کسی گوشے نے چھپا لیا ہے۔ خالی نگاہیں دور وہاں دیکھ رہی ہیں جہاں کچھ نہیں ہے۔

اور جب پلیٹ فارم پر سناٹا ہوگیا تو اس نے پان والے سے پوچھا۔'' آرہ جانے والی ٹرین کب آئے گی بھائی؟''

''وہ تو گئی بابا۔''

''لیکن یہ کیسے ہوا؟'' وہ کچھ زیرِ لب سا بڑبڑاتا ہے۔''میں تو یہیں اس بنچ پر بیٹھا انتظار کر رہا تھا، پھر کیسے؟''

''اب کل آنا بابا۔'' وہ کچھ اکتائی ہوئی آواز میں جواب دیتا ہے۔ لیکن اس کی آواز میں شاید تھوڑا سا ترحم بھی ہے، یا شاید مجھے ہی ایسا لگ رہا ہے۔

پان والے کے آئینے میں میری بوڑھی صورت ایک لمحے کے لیے جھلک جاتی ہے۔ دھوپ اب جگہ جگہ پھیلنے لگی ہے۔ نئے دن کا آغاز، کہ دوسرا آغاز اور نیا اختتام اور کوئی نیا مستقبل......سب کچھ بدلتے ہوئے آسمان میں سمٹنے لگا ہے۔

(شفیع جاوید)

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی

تجسّس	:	جاننے کی خواہش، جستجو
ترّحم	:	رحم دلی، مہربانی
تیرتھ یاتری	:	کسی مقدّس مقام کی زیارت کے لیے جانے والا
انتر آتما	:	ضمیر، روح، باطن
بے ریا	:	بے لوث، جس میں کسی طرح کا کھوٹ نہ ہو
Babylonian	:	بے بیلون کا رہنے والا
جلا وطن	:	اپنے وطن سے نکالا گیا
شرنارتھی	:	پناہ گزیں، مہاجر
اعصاب زدہ	:	جس کے اعصاب کمزور ہوں، اعصابی مریض
عہد و پیماں	:	پکّا وعدہ یا قرار
جزیرے	:	پانی کے بیچ میں خشک زمین
بلّوریں	:	شیشے کا
مقیّد	:	قیدی
راکنگ چیئر	:	جھولنے والی کرسی

غور کرنے کی بات

- ریلوے اسٹیشن کے ایک پلیٹ فارم پر صبح کی سیر کے وقت کے ایک معمولی سے واقعے کو بنیاد بنا کر یہ افسانہ لکھا گیا ہے۔ تھوڑے سے مکالمے اور زیادہ خود کلامی۔ اُفسردگی کے تانے بانے میں ڈرامائیت سے رہ رہ کر کچھ خوش گوار تبدیلیاں پیدا

© NCERT not to be republished

ہوتی ہیں۔ افسانہ نگار دوسرے کردار کا قصّہ بیان کرتے ہوئے انجام کے وقت خود افسانے کا حصّہ بن جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کا عنوان ''میں، وہ'' معنی خیز ہو گیا ہے۔

- اس افسانے میں ایک بوڑھے کو مرکزی کردار کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ وہ روزانہ ریلوے پلیٹ فارم کے ایک بنچ پر بیٹھ کر کسی ٹرین کا انتظار کرتا ہے اور پھر واپس چلا جاتا ہے۔ افسانہ نگار نے ایک ضعیف آدمی کی نفسیاتی الجھنوں اور بے چارگیوں کو معنی خیز انداز میں پیش کیا ہے۔
- افسانے میں بزرگ شخص نے اپنے تجربے اور علم کی روشنی میں اپنے بعض مشاہدات بھی ہلکے طنزیہ لہجے کے ساتھ پیش کیے ہیں۔ اس سے بوڑھے کے کردار کی گہرائی اور معنویت اُجاگر ہوتی ہے۔

سوالات

1. اس افسانے کا عنوان ''میں، وہ'' کیوں رکھا گیا ہے؟ پانچ جملوں میں لکھیے۔
2. ''تم نے زندگی کہاں دیکھی ہے بیٹا، تم کیا سمجھ پاؤ گے؟'' اس جملے کے ذریعے بوڑھا شخص کیا کہنا چاہتا ہے؟
3. ''اب موت نہیں، زندگی مایوس کرتی ہے'' اس جملے کی وضاحت افسانے کے سیاق وسباق میں کیجیے۔
4. بوڑھے کے کردار کی تصویر کشی اس افسانے میں کس طرح کی گئی ہے؟

عملی کام

- اس افسانے کا پلاٹ اپنے لفظوں میں لکھیے۔

© NCERT not to be republished

یادیں

اردو کے کئی ادیبوں نے اپنی زندگی کے اکثر اہم تجربات اور واقعات کو ’یادیں‘ کے عنوان سے مرتّب کیا ہے۔ ’یادیں‘ کے برعکس ’سوانح‘ کا دائرہ وسیع ہوتا ہے۔ ’یادیں‘ اُسی کے ذیل میں آتی ہیں۔ ’سوانح‘ میں ترتیب و تسلسل پایا جاتا ہے، جب کہ یادوں میں سوانحی تسلسل کو قائم رکھنے کی شرط ضروری نہیں۔ یادیں قلم بند کرنے والا بہت سی یادوں میں سے، محض اُن یادوں کا انتخاب کرتا ہے، جو کسی نہ کسی پہلو سے اہم، نمایاں اور توجّہ طلب ہوتی ہیں۔ بعض ادیب ’یادیں‘ کے لیے اب ’یادنگاری‘ کی اصطلاح بھی استعمال کرنے لگے ہیں۔ ’یادنگاری‘ کوئی باقاعدہ صنفِ ادب تو نہیں ہے، لیکن ’یادیں‘ کے تحت بعض ادیبوں کی بہت دل چسپ تحریریں سامنے آچکی ہیں، اِس لیے ممکن ہے مستقبل قریب میں اِسے ایک مستقل صنف کا درجہ بھی مل جائے۔

© NCERT not to be republished

سجّاد ظہیر

1905 تا 1973

سجاد ظہیر لکھنؤ کے ایک معزّز گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد وزیر حسن لکھنؤ کے معروف قانون داں تھے۔ حکومت نے اُنھیں سر کے خطاب سے نوازا تھا۔ باہر کی دنیا میں سجاد ظہیر 'بنّے بھائی' کے نام سے بھی جانے گئے۔ سجاد ظہیر نے بیرسٹری کی تعلیم انگلستان میں حاصل کی، لیکن وکالت کو وہ اپنا پیشہ نہ بنا سکے۔ وہ ایک قابلِ ذکر ادیب، صحافی اور شاعر بھی تھے۔ انھیں اپنے دور کی سیاست اور افکار سے بھی غیر معمولی دل چسپی تھی۔ انھوں نے مارکسزم کے فلسفے کا گہرا مطالعہ کیا۔ کارل مارکس کے نظریات نے اُن کی زندگی کا رُخ بدل دیا۔ انگلستان میں تعلیم کے دوران ہی سجاد ظہیر نے محسوس کر لیا تھا کہ ہندوستان کی مفلسی اور پس ماندگی کا ایک بڑا سبب انگریز سامراج کی لوٹ کھسوٹ کی پالیسی ہے۔ آزادی کے بغیر بیشتر مسائل کا حل ممکن نہیں ہے۔ اسی خیال کے تحت سجاد ظہیر نے انگلستان میں ملک راج آنند، جیوتی گھوش اور ڈاکٹر محمد دین تاثیر جیسے دوستوں کے ساتھ مل کر ادیبوں کی ایک انجمن بنائی۔ اس انجمن کا نام ''انجمن ترقی پسند مصنفین'' رکھا گیا۔ ہندوستان میں یہ انجمن 1936 میں قائم ہوئی اور رفتہ رفتہ ایک تحریک بن گئی جسے اردو ادب کی تاریخ میں اہم حیثیت حاصل ہے۔

سجاد ظہیر نے انگلستان میں رہتے ہوئے کئی افسانے لکھے جو ''انگارے'' نام کے مجموعے میں شامل ہیں۔ اُن کا ناول ''لندن کی ایک رات'' اپنے موضوع اور تکنیک کے لحاظ سے بہت معروف ہے۔ 1948 میں وہ پاکستان چلے گئے۔ اپنے سیاسی نظریات کی بنا پر وہ حکومت کے عتاب کا شکار ہوئے اور کچھ روز جیل میں رہے۔ وہاں انھوں نے ''روشنائی'' اور ''ذکرِ حافظ'' جیسی اہم کتابیں لکھیں۔ 1955 میں وہ ہندوستان واپس آ گئے اور اپنا تمام وقت ترقی پسند تحریک کے لیے وقف کر دیا۔ انجمن کی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ انھوں نے لکھنے کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔

اُن کی کتاب ''پگھلا نیلم'' کو نثری نظم کا پہلا مجموعہ کہا جاتا ہے۔ سجّاد ظہیر نے جیل سے جو خطوط اپنی بیگم رضیہ سجّاد ظہیر کے نام لکھے تھے وہ ''نقوشِ زنداں'' کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔ سجاد ظہیر ایک کامیاب صحافی بھی تھے۔ انھوں نے الگ الگ وقتوں میں کئی رسائل اخبارات مثلاً ''چنگاری''، ''بھارت''، ''قومی جنگ''، ''عوامی دور'' اور ''حیات'' کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔

© NCERT not to be republished

5257CH10

روشنائی

1937 کی گرمیوں کے شروع میں پنجاب کسان کمیٹی کا سالانہ اجلاس امرتسر میں ہونا قرار پایا۔صوبۂ متحدہ کی کسان سبھا کے کارکنوں کی حیثیت سے ڈاکٹر اشرف کو اور مجھے اس کانفرنس میں شرکت کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ ہم دونوں اس کے آرزومند بھی تھے۔ اس لیے کہ پنجاب کی کسان تحریک ہمارے صوبہ کی کسان تحریک سے زیادہ مضبوط تھی اور ہم چاہتے تھے کہ اپنی آنکھوں سے پنجاب کے جری اور آزادی خواہ کسان عوام کو ہزاروں کی تعداد میں ایک جگہ پر جمع دیکھیں۔ ان کے اتّحاد، طاقت اور انقلابی جذبے کا ذاتی تجربہ کریں، اور اس طرح خود اپنے انقلابی شعور کو وسعت دیں۔

اس کے چند دنوں بعد مجھے اطلاع ملی کہ اس موقعے پر پنجاب کے ترقی پسند مصنفین نے بھی امرتسر میں اپنی کانفرنس کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ انھوں نے مجھے لکھا کہ چونکہ یہ ان کی پہلی صوبائی کانفرنس ہے، جس کے بعد لاہور اور امرتسر کے علاوہ دوسرے مقامات پر بھی انجمن کی شاخیں قائم ہونے کی امید کی جاتی ہے، اس لیے انجمن کے کل ہند جنرل سکریٹری کی حیثیت سے میری شرکت اس کانفرنس میں ضروری ہے۔

اب میرے لیے امرتسر پہنچنا اور بھی زیادہ ضروری ہوگیا۔کسان کانفرنس جلیانوالہ باغ میں تھی، جہاں پر ہزاروں پنجابی کسان اکٹھّے ہوئے تھے۔ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس بھی یہیں ہونا قرار پائی،فیض اس کے مہتمم تھے۔کسان کانفرنس کے موقعے پر وہ ایک بستہ ہاتھ میں لیے جلیانوالہ باغ میں اِدھر اُدھر مسکراتے، گھومتے ہوئے مجھے کبھی کبھی نظر آجاتے۔ میں نے ان سے کہا کہ ''اس ہنگامے اور مجمعے میں مصنّفین کی کانفرنس کیسے ہوگی؟ کسان کانفرنس کے سیشن جب ختم بھی ہوجاتے ہیں اس وقت بھی کافی بڑا مجمع کانفرنس کے پنڈال میں موجود رہتا ہے۔فیضؔ نے کہا کہ کیا کریں، ہم نے بہت کوشش کی کہ مقامی کالجوں یا اسکولوں میں سے کوئی ہمیں دو دن کانفرنس کرنے کے لیے ایک چھوٹا سا ہال دے دے لیکن کوئی بھی راضی نہ ہوا۔ آخر کو ہم نے کسان کانفرنس والوں سے کہا، وہ بڑی خوشی سے خالی وقت میں اپنا پنڈال دینے کے لیے راضی ہوگئے۔ اچھّا ہے۔ پنجاب کے کسان اپنے عوامی مصنّفین کی صورتیں تو دیکھ لیں اور مصنّفین کے لیے بھی کسانوں کے سائے میں اپنی کارروائی کرنا مفید ہوگا۔'' مجھے تعجب اس پر تھا کہ ایم۔اے۔او۔ کالج والوں نے بھی ہال نہیں دیا۔تاثیر اس کے پرنسپل تھے اور فیضؔ وہاں پڑھاتے تھے۔فیضؔ نے کہا کہ ''بس سمجھ

© NCERT not to be republished

لیجیے یہاں کے بعض حلقے ہماری انجمن کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔'' جس شان سے ترقی پسندوں کی یہ کانفرنس ہوئی ویسے شاید ہی کوئی اور ہوئی ہو۔ پنڈال تو بہت بڑا تھا جس میں دس ہزار آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ ہماری کانفرنس میں زیادہ سے زیادہ دوسو آدمی شریک ہوئے۔اس لیے آخر وقت میں یہ فیصلہ ہوا کہ پنڈال کے ڈائس پر (جو جلیانوالہ باغ کے درمیان پکّے چبوترے پر تھا) ہی کانفرنس کرلی جائے۔سارے پنڈال کو ہم استعمال نہ کریں۔

ایک دن صبح کے سیشن کے بعد دوپہر کو کسان کانفرنس کا اجلاس نہیں تھا۔ اسی دن تیسرے پہر کو مصنّفین کی کانفرنس جلیانوالہ باغ کے چبوترے پر ہوئی۔ اوپر ایک پھٹا سا شامیانہ تھا اور نیچے ایک میلی پرانی دری، جو صبح کے کسان جلسے کے بعد اور بھی مٹی میں لتھڑ گئی تھی اور جسے کوئی صاف کرنے والا نہیں تھا۔کرسیاں یا میز وہاں بالکل نہ تھیں، اس لیے سب لوگ دری پر بیٹھ گئے۔کانفرنس میں شریک ہونے والوں میں سب تو مجھے یاد نہیں، لیکن وہ جن کی صورتیں ابھی تک نظروں میں ہیں یہ تھے۔ چراغ حسن حسرت، ڈاکٹر تاثیر، فیروز دین منصور، ٹیکا رام سخن، پروفیسر محبّ الحسن، رگھونش کمار کپور (ڈی۔اے۔وی۔ کالج) رگھوپتی چوپڑا، پروفیسر سنت سنگھ (خالصہ کالج)، ڈاکٹر اشرف، فیض ان کے علاوہ پنجاب کے کئی عوامی کسان شاعر بھی تھے۔ مجھے ظہیر کاشمیری یا کرشن چندر کی اس کانفرنس میں شرکت یاد نہیں۔ممکن ہے رہے ہوں۔اس وقت ادیب کی حیثیت سے ہم انھیں نہیں جانتے تھے۔اجلاس میں پنجاب کے دوسرے شہروں کے بھی نمائندے تھے،جن کی کل تعداد پچیس تیس رہی ہوگی۔لیکن حاضرین کی تعداد کئی سو تھی، جو پورے چبوترے پر سمٹے بیٹھے تھے۔ان میں اکثر طالب علم، شہر کے نوجوان، دانشور اور وہ کسان تھے جن کو ادب،شعروشاعری سے دل چسپی تھی۔

اس کانفرنس کی روداد مجھے یاد نہیں۔ممکن ہے فیض کو یاد ہو یا ان کے پاس کانفرنس کی تجاویز اور بحثوں کی رپورٹ محفوظ ہو،لیکن میرا خیال ہے کہ اس کانفرنس کی روداد سے زیادہ اہم اس کا ماحول اور اسکی فضا تھی۔ مجھے ابھی تک یاد ہے کہ اس کانفرنس کی بے سروسامانی اور بے ترتیبی پر مجھے کسی قدر جھنجھلاہٹ اور بے اطمینانی ہوئی تھی۔اس ہنگامے میں سنجیدہ ادبی بحث ممکن نہ تھی۔ مگر ادب میں محض سنجیدگی ہی کی تو ضرورت نہیں ۔درمیانہ طبقے کے دانشور جو اپنے کو عام طور سے تنہا، کمزور اور بے بس تصور کرتے ہیں، کیا محنت کش عوام کے مجمعے کی طاقت سے اپنی روح اور نفس کو تازہ اور جاندار بنانا نہیں چاہتے؟ بوڑھے، نوجوان اور درمیانہ عمر کے محنت کشوں کی ہزاروں آنکھیں چاروں طرف سے تعجب اور ہمدردی کے ساتھ جلیانوالہ باغ کے چبوترے پر بیٹھے ہوئے اس مجمعے کو دیکھ رہی تھیں۔ان کی سمجھ میں ان کی بہت سی باتیں نہ آتی ہوں، لیکن وہ جانتے تھے کہ یہ ادیب ان کی طرف ہیں، یہ ان کے ساتھ ہیں۔ان کے دل میں یہ خواہش ضرور ہوگی کہ کاش یہ ایسی زبان میں بات کرتے جو ان کی سمجھ میں پوری طرح آتی۔اور ادیب بھی

© NCERT not to be republished

سوچتے ہوں گے، ابھی ہم ان کے بیچ میں بیٹھ تو گئے ہیں لیکن ان کی زبان میں ان کے دل کی بات کہنے کے لیے ہمیں اور زیادہ ان کے پاس جانا ہوگا۔ حُبِ وطن کا وہ شعلہ جو جلیانوالہ باغ کے شہیدوں نے اپنا خون بہا کر روشن کیا تھا، کیا ایک نہ ایک دن ہمارے قومی ادب کی لکیروں کو بھی تابندہ نہیں کرے گا۔ ایسی لکیریں اور ایسے لفظ جو عوام کے دلوں میں کھُب جائیں اور ان کے دماغ میں اُجالا کریں اور ان کو آزادی اور ترقی کی شاہراہ پر زیادہ تیزی اور ثابت قدمی سے آگے بڑھائیں۔

پنجاب کے اسی سفر میں مجھے علامہ اقبال سے ملنے کی بھی سعادت نصیب ہوئی۔ پہلی بار جب میں لاہور آیا تھا تو ڈاکٹر صاحب سے ملاقات نہیں ہوسکی تھی۔ ظاہر ہے اقبال سے ملنا اور ترقی پسند اَدب کی تحریک کے متعلق ان سے گفتگو کرنا ہمارے لیے ضروری تھا۔ تاثیر نے امرتسر میں ہمیں بتایا کہ انھوں نے علاّمہ سے نئی تحریک کے بارے میں گفتگو کی ہے۔ انھوں نے اس سے ہمدردی اور دل چسپی کا اظہار کیا ہے۔

امرتسر سے ڈاکٹر اشرف اور میں لاہور آئے اور میاں افتخار الدین کے یہاں ٹھہرے۔ میاں صاحب نے علامہ اقبال سے ہمارے ملنے کا وقت مقرر کیا۔ ہم تیسرے پہر، چائے کے بعد ان کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ گرمیوں کے دن تھے اور اقبال اپنی کوٹھی کے باہر ایک کھردری بان کی چارپائی پر نیم دراز اپنے بستر کا تکیہ لگائے بیٹھے تھے اور حقّہ پی رہے تھے۔ وہ اشرف سے اور مجھ سے بڑے تپاک اور شفقت سے ملے۔ ان کے پلنگ کے گرد جو تین چار مونڈھے رکھے ہوئے تھے ہم ان پر بیٹھ گئے۔ ہم دونوں ڈاکٹر صاحب کے داہنے طرف تھے۔ اقبال سے پہلی بار ملاقات کا تجربہ میرے لیے کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ان کا کلام بچپن سے ہمارے ذہن اور روح بلکہ خون میں رچا ہوا تھا۔ چھوٹی عمر میں جب ہماری زبان میں لکنت تھی، ہم کو ان کے قومی اور ملّی ترانے یاد کرائے گئے تھے۔ جوں جوں عمر بڑھی اور شعور آیا مسدسِ حالی کے ساتھ ساتھ شکوہ، جوابِ شکوہ، شمع وشاعر کے بیشتر حصّے وردِ زبان رہتے تھے۔ انگلستان کی تعلیم کے زمانے میں اقبال کا فارسی کلام پڑھتے رہے۔ میں خود جب اپنی ذہنی اور اَدبی تربیت کے متعلق اپنی طالب علمی کے زمانے کا خیال کرتا ہوں تو اُردو کے شاعروں میں انیس، غالب، حالی، اور اقبال کا اس میں سب سے زیادہ حصّہ نظر آتا ہے۔

ہمارے ساتھ علامہ اقبال کے التفات وعنایت کا انداز ہی کچھ ایسا تھا کہ مجھے جرأت ہوئی کہ سب سے پہلے ان سے ہمیں جو اختلاف اور شکایتیں تھیں، وہی ان کے سامنے پیش کروں اور محض عقیدت مندی کی باتیں نہ کروں۔ سوشلزم کے بارے میں گفتگو شروع ہوگئی۔

میں نے کہا کہ نوجوان ترقی پسند ادیبوں کا گروہ اس نئے نظریے سے کافی متاثر ہے۔ وہ بڑی توجہ اور سنجیدگی سے میری باتیں سنتے رہے۔ بلکہ مجھے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس طرح کی باتوں کے لیے میری ہمّت افزائی فرمارہے ہیں۔ پھر انھوں نے کہا

’’تاثیر نے مجھ سے ترقی پسند تحریک کے متعلق دو ایک بار باتیں کی تھیں اور مجھے اس سے بڑی دل چسپی ہوئی...... ممکن ہے سوشلزم کے سمجھنے میں مجھ سے غلطی ہوئی ہو۔۔۔۔بات یہ ہے کہ میں نے اس کے متعلق کافی پڑھا بھی نہیں ہے۔میں نے تاثیر سے کہا تھا کہ وہ اس موضوع پر مجھے مستند کتابیں دیں۔انھوں نے وعدہ کیا تھا، لیکن ابھی تک پورا نہیں کیا۔۔۔۔میرا نقطۂ نظر آپ جانتے ہیں۔ظاہر ہے کہ مجھے ترقی پسند اَدب یا سوشلزم کی تحریک کے ساتھ ہمدردی ہے۔آپ لوگ مجھ سے ملتے رہیے۔‘‘

علامہ اقبالؔ سے ترقی پسند اَدب کی تحریک کے متعلق ہماری بات چیت تشنہ اور نامکمّل رہی، اس کا مجھے افسوس رہا۔خاص طور پر اس وجہ سے کہ علاّمہ اقبال نے ہماری تحریک کے ساتھ دل چسپی اور ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔میں نے تہیّہ کیا کہ اگلی بار جب پنجاب آؤں گا تو ان سے پھر مل کر تحریک کے متعلق زیادہ وضاحت سے گفتگو کروں گا۔لیکن بدقسمتی سے اس کا موقع نہیں ملا۔جب میں دوبارہ لاہور گیا تو وہ طائرِ قدسی اس جہان سے پرواز کر چکا تھا۔

(سجّاد ظہیر)

مشق

لفظ و معنی

جری	:	جرات مند، بہادر
انقلابی شعور	:	دنیا اور حالات کو تبدیل کرنے کا احساس
مہتمم	:	اہتمام کرنے والا
تابندہ	:	روشن
دانش ور	:	روشن خیال، اہلِ علم، عقل وفہم کی بنیاد پر رائے قائم کرنے والا شخص
سعادت	:	توفیق، خوش نصیبی
لکنت	:	ہکلاہٹ

© NCERT not to be republished

سوشلزم	:	اشتراکیت، سماج واد
مستند	:	معتبر، قابلِ اعتماد

غور کرنے کی بات

- پنجاب کے کسان بڑے بہادر اور محنت کش ہوتے ہیں۔
- کسان کانفرنس اور ترقی پسند مصنّفین کی کانفرنس جہاں منعقد کی جارہی تھی، اس مقام کا نام جلیانوالہ باغ ہے، جو امرتسر میں واقع ہے۔ جنگ آزادی کی تاریخ میں اس مقام کی خاص اہمیت ہے۔ یہاں 1920 میں آزادی کے متوالوں کا ایک جلسہ ہو رہا تھا جس پر جنرل ڈایر کے حکم سے اندھا دھند گولیاں برسائی گئی تھیں۔ اور آن کی آن میں سینکڑوں بے قصور لوگوں کو اپنی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑا تھا۔ یہ سب شہیدانِ وطن کہلاتے ہیں۔
- وہ ادیب جو ایک بڑے سماجی اور تہذیبی مقصد کو لے کر چلتے ہیں، اُن میں بڑی خاکساری ہوتی ہے۔ اس مضمون میں ''پھٹے سے شامیانے اور میلی پرانی دری جو مٹّی میں لتھڑ گئی تھی'' جیسے فقرے اُن کی اسی بے نیازی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔
- ترقی پسند مصنّفین محنت کش کسانوں اور مزدوروں کے ہم درد تھے کیوں کہ یہ وہ طبقہ ہے جس کی ہمیشہ حق تلفی کی گئی ہے۔
- ''روشنائی'' کے اس حصّے میں اقبال اور ان کے پہلے مجموعۂ کلام ''بانگ درا'' کا بھی ذکر ہے۔ ساتھ ہی حاؔلی اور ان کی نظم ''مسدسِ حالی'' کا بھی حوالہ ہے جس کا عنوان ''مدّ و جزرِ اسلام'' ہے۔ نظم کی تاریخ میں حالی اور اقبال کا درجہ بہت بلند ہے۔

سوالات

1. پنجابی کسان کانفرنس اور ترقی پسند مصنّفین کی کانفرنس کہاں منعقد ہوئی تھی؟
2. جنگِ آزادی کی تاریخ میں جلیانوالہ باغ کی کیا اہمیت ہے؟
3. سجاد ظہیر نے علامہ اقبال کو کن خاص باتوں کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی تھی؟
4. علامہ اقبال نے سجاد ظہیر کی باتوں کا کیا جواب دیا؟

عملی کام

- کانفرنس میں شامل شاعروں اور ادیبوں کے ناموں کی فہرست بنائیے۔

© NCERT not to be republished

آپ بیتی

خودنوشت یا آپ بیتی کا مطلب ہے اپنی زندگی کا حال بیان کرنا۔اس بیان کے دائرے میں پوری زندگی بھی آسکتی ہے اور زندگی کا کوئی خاص دور یا واقعہ بھی۔

خودنوشت کیوں لکھی جاتی ہے؟ اس سوال کے کئی جواب ہوسکتے ہیں۔مثلاً یہ کہ لکھنے والا اپنی یادوں کو مرتّب اور محفوظ کرنا چاہتا ہے۔یا یہ کہ لکھنے والا اپنے تجربوں میں پڑھنے والوں کو بھی شریک کرنا چاہتا ہے۔یا یہ کہ لکھنے والا اپنے قاری کو یہ بتانا چاہتا ہے کہ اس نے دنیا اور اس کے لوگوں کو کس نظر سے دیکھا ہے۔

اچھّی خودنوشت میں لکھنے والا خود اپنے منہ میاں مٹھو نہیں بنتا۔اسی لیے خودنوشت لکھنے والے کو ہمیشہ بہت ضبط و احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔دوسروں کے بیان میں بھی سچّائی اور دیانت داری کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

اردو میں خودنوشت کی روایت زیادہ پرانی نہیں ہے۔مولانا جعفر تھانیسری کی آپ بیتی ''کالا پانی'' کو اردو کی پہلی خودنوشت کہا جاتا ہے۔اس کی اشاعت 1923 میں ہوئی۔اگرچہ اسے اشاعت سے بہت پہلے لکھا جاچکا تھا۔

ہمارے زمانے میں رشید احمد صدیقی کی ''آشفتہ بیانی میری'' سر رضا علی کی ''اعمال نامہ'' جوشؔ ملیح آبادی کی ''یادوں کی برات''، قرۃ العین حیدر کا سوانحی ناول ''کارِ جہاں دراز ہے''، قدرت اللہ شہاب کی ''شہاب نامہ''، خلیق ابراہیم خلیقؔ کی ''منزلیں گرد کے مانند''، اختر الایمان کی ''اس آباد خرابے میں'' بہت مشہور ہوئیں۔خواتین کی آپ بیتیوں میں بیگم حمیدہ اختر کی ''ہم سفر''، ادا جعفری کی ''جو رہی سو بے خبری رہی'' اور سعیدہ بانو احمد کی ''ڈگر سے ہٹ کر'' بہت دل چسپ اور مقبول آپ بیتیاں ہیں۔

آپ بیتی بالعموم نثر میں لکھی جاتی ہے۔لیکن کچھ لوگوں نے منظوم آپ بیتیاں بھی لکھی ہیں۔

© NCERT not to be republished

اختر الایمان

1915 تا 1996

اختر الایمان کا اصل نام محمد اختر الایمان تھا۔وہ نجیب آباد، ضلع بجنور میں پیدا ہوئے۔ان کے والد مسجد میں امامت کرتے تھے۔اختر الایمان کی ابتدائی تعلیم مختلف گاؤں اور قصبوں کے مدرسوں اور اسکولوں میں ہوئی۔ انھوں نے میٹرک فتح پوری مسلم ہائی اسکول دہلی سے پاس کیا۔بی۔اے دہلی کالج (موجودہ ذاکر حسین کالج) سے کیا۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایم۔اے اردو میں داخلہ لیا مگر اسے مکمل نہ کر سکے۔ پہلا سال مکمل کرنے کے بعد پونہ چلے گئے جہاں فلموں کے لیے لکھتے رہے۔کچھ دنوں بعد ممبئی گئے اور پوری زندگی وہیں گزاری۔ممبئی کے اپنے پچاس سالہ قیام کے دوران انھوں نے بہت سی فلموں کے منظرنامے اور مکالمے لکھے۔ان کی لکھی ہوئی بعض فلمیں بہت مقبول ہوئیں۔مگر ایک بلند پایہ شاعر ہونے کے باوجود، انھوں نے فلموں کے لیے گانے کبھی نہیں لکھے۔

اختر الایمان کا شمار اردو کے بڑے نظم گو شعرا میں ہوتا ہے۔ان کے دس شعری مجموعے شائع ہوئے۔ پہلا مجموعہ ’’گرداب‘‘ اور آخری ’’زمستاں سرد مہری کا‘‘ ان کی وفات کے بعد شائع ہوا۔نثر میں انھوں نے اپنی آپ بیتی ’’اس آباد خرابے میں‘‘ کے علاوہ چند ادبی مضامین بھی لکھے ہیں۔

© NCERT not to be republished

5257CH11

اس آباد خرابے میں

رات کتنی گزر چکی تھی اب کچھ یاد نہیں صرف اتنا یاد ہے ہم عبداللہ پور (جمنا نگر) کے اسٹیشن پر اترے تھے۔ پلیٹ فارم پر لگی ہوئی مٹی کے تیل کی لالٹینیں اجالا کرنے کی پوری کوشش کررہی تھیں۔ اس کے باوجود بھی گردوپیش پر اندھیرا غالب تھا۔ میرے پاس ایک ٹین کا صندوق تھا جس کی بناوٹ ایسی تھی جیسے جسم پر آبلے پڑ جاتے ہیں۔ جگہ جگہ سے اٹھا ہوا تھا۔ ابّا نے وہ صندوق میرے سر پر رکھ دیا اور باقی سامان خود اٹھالیا اور ہم اسٹیشن سے باہر نکل کر بغیر کوئی سواری لیے ہوئے، ایک لمبی سڑک پر چل کھڑے ہوئے۔

ہم کہاں جارہے تھے، مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ پچھلا گاؤں، ہم جہاں سے چلے تھے، اس کا نام کمباسی تھا۔ اس گاؤں کے بارے میں ایسی کوئی تفصیل نہیں جو دل چسپ ہو۔ ایسا بھی کوئی واقعہ نہیں جو بہت اہم ہو، سوا اس بات کے کہ جس گھر میں ہم رہتے تھے، کہا جاتا تھا وہاں آسیب کا اثر ہے۔ رضوان پیدا ہوا تھا، جو تقریباً ہفتہ بھر یا پندرہ دن زندہ رہ کر مر گیا تھا۔ اپنے اس چھوٹے بھائی سے مجھے اتنا لگاؤ ہوگیا تھا کہ میں اس کی قبر پر چلا جاتا تھا اور وہاں بیٹھے روتا رہتا تھا۔ بستی کا کوئی آدمی ادھر سے گزرتا تھا تو مجھے گھر لے آتا تھا۔

© NCERT not to be republished

میرے والد امامت کا پیشہ کرتے تھے۔انھوں نے مذہبی تعلیم سہارنپور میں حاصل کی تھی۔ بہت اچھّے قاری تھے۔انھیں دیہات بہت پسند تھے۔امامت کے علاوہ مسجد کے صحن میں مکتب کھولتے تھے جہاں دیہات کے ہر عمر کے لڑکے لڑکیاں پڑھنے آتے تھے۔

یہ دیہات جس میں میرا بچپن گزرا زیادہ تر مسلمان آرائیوں اور راجپوتوں کے تھے۔ان دیہاتوں کا اور میرا بڑا ذہنی تعلق ہے۔میں بچپن سے اکیلا ہوں۔والدہ جب اپنے میکے چلی جاتی تھیں، میں والد کے پاس رہتا تھا۔میری تعلیم کا ہرج نہ ہو اس خیال سے وہ مجھے امّاں کے ساتھ نہیں جانے دیتے تھے۔میری تعلیم کا تصوّر ان کے ذہن میں وہی تھا جو انھوں نے خود حاصل کی تھی۔قرآن حفظ کرنا اور اردو، فارسی کی تھوڑی شد بد تاکہ بڑا ہو کر میں بھی ان کی طرح امامت کا پیشہ اختیار کر سکوں، مگر یہ خانہ بدوشانہ زندگی جو میرے والد نے اختیار کر رکھی تھی، اس نے کبھی مجھے ایک طرح کی تعلیم پر نہیں جمنے دیا۔کبھی سرکاری اسکول میں داخل کر دیا جاتا تھا۔کبھی قرآن حفظ کرنے پر لگا دیا جاتا تھا اور بس۔دن رات اسی طرح گزرتے چلے جا رہے تھے۔

ان تصویروں میں جن کا تعلق میرے ذہنی پس منظر سے ہے ایک تصویر میرے ذہن میں بہت واضح ہے۔میں ایک بیل گاڑی کے پاس کھڑا ہوں۔ہم ایک گاؤں چھوڑ کر دوسرے گاؤں میں جا رہے ہیں۔ہمارا سامان بیل گاڑی میں لادا جا رہا ہے اور میں یہ منظر بڑی بے بسی کے ساتھ دیکھ رہا ہوں۔بے بسی اس لیے کہ میں یہ گاؤں نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔اس گاؤں کا نام رَکڑی تھا۔ یہاں بہت سے جوہڑ تھے۔جوہڑوں میں کنول اور نیلوفر کھلتے تھے۔سب طرف بڑے بڑے آموں کے گھنے باغ تھے۔باغوں میں کھلیان پڑتے تھے۔کویلیں کوکتی تھیں۔پپیہے بولتے تھے۔ہرے ہرے جنگلوں اور کھیتوں میں ہرنوں کی ڈاریں کلیلیں کرتی دکھائی دیتی تھیں۔کیکر اور کھجور کے پیڑوں میں بَیوں کے گھونسلے تھے جن میں بیٹھے وہ جھولتے رہتے تھے، گیت گاتے رہتے تھے۔ایک دوسرے کا تعاقب کرتے رہتے تھے۔پدّے تھے۔شامائیں تھیں، لال تھے جو موسم کی تبدیلی کے ساتھ رنگ بدلتے تھے، مینائیں تھیں، خوبصورت آواز والے دیڑ تھے۔غرض کہ وہ سب کچھ تھا جو مجھے مرغوب اور پسند تھا۔مگر میری مرضی نہیں چلی، مجھے گاڑی میں بٹھا دیا گیا اور گاڑی مجھے لے کر روانہ ہوگئی۔مگر میں وہیں کھڑا رہ گیا۔یہی وہ گاؤں رکڑی تھا جسے چھوڑ کر ہم کمباسی گئے تھے۔

عبداللہ پور (جمنا نگر) سے چل کر ہم جگادھری پہنچے۔شہر کے باہر، سڑک کنارے ایک چوکی تھی وہاں جو چوکیدار تھا، ابّا سے جانے کیوں اس کی تکرار ہوگئی۔ابّا ایک دم بگڑ گئے، جھگڑا شاید اس پر ہوا تھا کہ وہاں رات گزارنا چاہتے تھے۔اس جھگڑے کے بعد، انھوں نے وہاں رات گزارنے کا ارادہ ترک کر دیا اور دوسری سمت جانے والی ایک کچّی سڑک پر مڑ گئے۔

رات چاندنی تھی۔ کچّی سڑک پر تھوڑی دیر چلنے کے بعد ایک بہت بڑا تالاب آیا۔ابّا تالاب کے کنارے رک گئے۔آگے تالاب سے گزر کر جانا تھا۔تھوڑی دیر سوچنے کے بعد ابّا نے کہا: ''میرے پیچھے پیچھے آؤ''، اور لاٹھی سے پانی ناپتے ہوئے تالاب میں

اتر گئے اور دھیرے دھیرے لاٹھی سے پانی ناپتے ناپتے دوسری طرف پہنچ گئے۔ تالاب سے گزرنے کے بعد راستے میں دو تین باغ پڑے مگر ابّا نہیں رُکے۔ اس کے بعد ایک کانس کا جنگل آیا مگر وہ چلتے رہے۔ ہم بہت دیر تک چلتے رہے۔ جنگل کے بولتے سناٹے کے سِوا اور کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ گاہے گاہے آس پاس سے گیدڑوں کے بولنے کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ بہت دیر چلنے کے بعد پھر ایک جوہڑ آیا جس کے دائیں طرف کانس کا جنگل تھا اور سامنے ایک باغ۔ ابّا نے باغ میں سامان رکھ دیا۔ ایک چادر نکال کر بچھا دی اور کہا سو جاؤ۔ میں لیٹتے ہی سو گیا۔

یہ جگہ جہاں ہم نے رات قیام کیا تھا ایک قبرستان تھا۔ کمباسی سے ہم جس جگہ کے لیے روانہ ہوئے تھے، اس کا نام سَکھ مدرسہ تھا۔ ابّا نے ایک راہ گیر سے دریافت کیا۔ معلوم ہوا سکھ مدرسہ اس جگہ سے بہت قریب ہے۔ وہ باغ جہاں ہم نے رات قیام کیا تھا اور سکھ مدرسہ کے بیچ وہی کانس کا جنگل جس کا میں نے ذکر کیا ہے اسی باغ سے تھوڑے فاصلے پر ایک گاؤں تھا۔ جس کا نام سکھ تھا اسی نسبت سے اس مدرسے کا نام سکھ مدرسہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہم سکھ مدرسہ پہنچ گئے۔

سکھ مدرسہ دراصل ایک یتیم خانہ تھا جو ایک بغیر چھت کی مسجد اور چند پھونس کے چھپّروں پر مشتمل تھا۔ اس سکھ مدرسہ کے مہتمم اور روح رواں حافظ اللہ دیا نام کے ایک صاحب تھے۔ گورے چٹّے، قد تھوڑا نکلتا ہوا، طباق سا چہرہ اور پھیلی ہوئی ناک، بات چیت میں اچھے تھے اور گوارا آداب واطوار کے انسان تھے۔ جب ہم سکھ مدرسہ میں آئے امّاں اپنے میکے چلی گئی تھیں۔ ابّا یہاں کیوں آئے تھے، مجھے نہیں معلوم، اس لیے کہ یہاں امامت کا کوئی سلسلہ نہیں تھا۔ اس مدرسے میں تیس پینتیس لڑکے تھے۔ یہاں دینی تعلیم کا انتظام بھی تھا۔ جہاں نہ صرف اس مدرسے کے لڑکے پڑھتے بلکہ سکھ بستی کے لڑکے لڑکیاں بھی آتے تھے۔

یہ مدرسہ جنگل کے بیچوں بیچ تھا، جس کے دو طرف کھیت تھے۔ تیسری طرف آموں کا باغ اور سکھ بستی اور چوتھی جانب کانس کا بہت بڑا جنگل، جس کے ایک سرے پر ایک بہت بڑی جھیل تھی جس کے پانی میں مگر مچھ تیرتے دکھائی دیتے تھے جو کبھی کبھی کنارے پر بھی آ جاتے تھے اور دھوپ میں لیٹے رہتے تھے۔ جھیل کا بیشتر حصّہ نرسُل اور پٹیرے کے جھنڈ سے پٹا ہوا تھا۔

یہاں مرغابی اور چہے کا شکار کرنے بہت شکاری آتے تھے، خاص طور پر انگریز۔ سردیوں میں جب کانس کا جنگل پھولتا تھا تو بہت اچھا لگتا تھا۔

کچھ روز ساتھ رہ کر میرے والد مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ بعد میں پتہ چلا انھوں نے امامت کا پیشہ ترک کر دیا اور مدرسے کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کا کام اپنے ذمے لیا تھا۔ مدرسے کے لیے چندہ وہ گاؤں گاؤں گھوم کر کرتے تھے۔ حافظ اللہ دیا بھی زیادہ تر یہی کام کرتے تھے اور گرمیوں میں چندہ اکٹھا کرنے شملہ چلے جاتے تھے۔ یہاں پھر قرآن حفظ کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جانے

سے پہلے ایک دن ابّا نے مجھے نماز سکھائی۔ پوچھا سورۂ فاتحہ آتی ہے؟ میں نے نیت باندھے باندھے کہا ——— ''آتی ہے۔'' کہنے لگے نماز کی نیت بندھی ہو تو بولا نہیں کرتے۔ میں نے نیت باندھے باندھے کہا— ''اچھا''۔ سکھ مدرسہ چندے کے روپیہ پر کم چل رہا تھا اللہ کی مرضی اور توکّل پر زیادہ۔ یہاں کھانا کم اور کھانے کا انتظار زیادہ رہتا تھا۔ راتوں کو افزائش رزق کے لیے چلّہ کشی اور قرآن خوانی ہوتی۔ جب کئی دن تک آس پاس کے گاؤں سے کوئی دعوت یا اور کچھ کھانے کو نہیں آتا تھا تو لڑکوں کو منہ اندھیرے اٹھایا جاتا تھا۔ انھیں کچھ کنکریاں دے دی جاتی تھیں جن پر وہ قرآن کی سورۃ کئی کئی بار پڑھ کر دم کیا کرتے تھے۔ کون سی سورۃ تھی، اس وقت مجھے یاد نہیں۔ سردیوں کی راتوں میں اٹھنا مصیبت معلوم ہوتا تھا مگر قہرِ درویش بر جانِ درویش۔

کچھ دن بعد ابّا واپس آ گئے۔ امّاں بھی آ گئیں۔ ایک رات امّاں سوتے سوتے ایک دم ہڑبڑا کر اٹھیں۔ انھیں اپنے سینے پر کچھ رینگتا ہوا محسوس ہوا۔ انھوں نے جھٹک دیا۔ ابّا نے جلدی سے لالٹین جلائی دیکھا ایک چھوٹا سا سانپ ہے۔ ایک رات ہم چولھے کے پاس بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ اچانک چولھے کی عقبی دیوار سے ایک بہت بڑا سانپ نکلا اور تیزی سے دوسری طرف چلا گیا اور غائب ہو گیا۔ اس کے علاوہ اور بھی کچھ یادیں ہیں، جن میں دو اہم یہ ہیں۔ ایک لالی کا سر اور دوسرے برسات کے کیڑے۔

سکھ مدرسہ میں دو بہن بھائی پڑھتے تھے۔ لڑکے کا نام میرے ذہن میں نہیں۔ لڑکی کا نام لالی تھا۔ وہ کسی بیرے یا بٹلر کے بچّے تھے جو شملہ میں کام کرتا تھا۔ انھیں حافظ اللہ دیا لے آئے تھے۔ لالی بہت چھوٹی تھی۔ یہی کوئی چار پانچ سال کی ہوگی۔ سب لڑکے اس سے بڑا لاڈ کرتے تھے۔ ایک روز سو کر اٹھے تو معلوم ہوا لالی غائب ہے۔ سب کو بڑا تعجب ہوا۔ وہ کہاں جا سکتی ہے۔ مدرسے میں ہر جگہ ڈھونڈا مگر نہیں ملی۔ سب جنگل کی طرف دوڑے۔ اسے پکارتے ہوئے کچھ لڑکے جنگل میں ایک طرف گئے، کچھ دوسری طرف، آخر لالی مل گئی۔ ایک بھِٹ کے باہر کچھ خون، خون میں لت پت لالی کے کپڑے اور اس کی کھوپڑی پڑی تھی۔ اسے لکڑ بگھا اٹھا لے گیا تھا۔

ہر طرف جنگل ہونے کی وجہ سے رات کو بھنگے اور پتنگے بہت آتے تھے اور جب کھانا کھانے بیٹھتے تھے تو دال میں گر گر جاتے تھے۔ ان کی بو اتنی تیز اور خراب ہوتی تھی کہ اب تک میری ناک میں بسی ہوئی ہے۔

کچھ مدّت بعد ابّا اور حافظ اللہ دیا میں اختلاف ہو گیا۔ کیوں؟ اس کی تفصیل مجھے نہیں معلوم، مگر اس اختلاف میں نابینا حافظ کا ہاتھ ضرور تھا۔

اس واقعے کے بعد سکھ مدرسے سے ہمارا سلسلہ منقطع ہو گیا اور ہم رہنے کے لیے سکھ بستی میں چلے گئے۔

سکھ بستی پچاس ساٹھ گھروں کا ایک چھوٹا سا گاؤں تھا، جس میں زیادہ تر مسلمان راجپوت اور ارائیں کاشت کار تھے وہاں

© NCERT not to be republished

رحمت اللہ نام کا ایک شخص تھا جس نے اپنی حویلی کا ایک حصّہ ہمیں رہنے کے لیے دے دیا تھا۔میری تعلیم کا ڈھرّا پھر بدل گیا۔میں سگھ مدرسے میں قرآن حفظ کر رہا تھا،مگر سگھ بستی میں آنے کے بعد ابّا نے مجھے سرکاری اسکول میں داخل کرادیا۔سگھ سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ایک پرانا قصبہ تھا جس کا نام بوڑیہ تھا۔وہاں ایک مڈل اسکول تھا۔پڑھنے کے لیے میں وہاں جانے لگا۔مدرسے کے قریب ایک محل نما مکان،محل نما کیا محل ہی تھا۔کس کا تھا نہیں معلوم۔بہت سال بعد معلوم ہوا وہ بیربل کا محل تھا۔قصبہ بوڑیہ بھی بہت قدیم بستی معلوم ہوتا تھا۔جگہ جگہ منہدم مکانات تھے۔ایسا محسوس ہوتا تھا یہ شہر ضرور کسی قدیم تہذیب کا حصّہ ہے۔ابھی سال پہلے میں نے اخبار میں پڑھا، وہاں کھدائی ہوئی دو تین صدی قبل مسیح کی تہذیب کے آثار ملے۔

سگھ بستی سے نکلتے ہی دائیں بائیں آموں کے باغ تھے اور بیچ میں کانس کا جنگل۔بوڑیہ کا راستہ اسی جنگل سے ہوکر گزرتا تھا۔یہ اسی کانس کے جنگل کا سلسلہ تھا جو سگھ مدرسے کے اردگرد پھیلا ہوا تھا۔مارکنڈ ندی اس جنگل کو چھوتی ہوئی گزرتی تھی۔پانی صرف برسات کے دنوں میں ہوتا تھا۔باقی دنوں میں مارکنڈ سوکھا پڑا رہتا تھا۔چلچلاتی دھوپ اور یخ بستہ سردیوں میں جب میں اس ندی کی ریت پر سے ننگے پاؤں گزرتا تھا،تو میرے آنسو نکل آتے تھے۔تلووں کو دھوپ اتنا نہیں جلاتی تھی جتنا سردی جلاتی تھی۔مجھے اکثر ایسا احساس ہوتا ہے جیسے اس بستی میں کئی جنم گزارے تھے۔کتنا اتار چڑھاؤ دیکھا اور بھگتا، جیسے ہفت خواں طے کیا ہو۔

(اخترالایمان)

مشق

لفظ و معنی

آسیب	:	بھوت پریت
خانہ بدوش	:	بے ٹھکانا، جس کا کوئی مستقل گھر نہ ہو
جوہڑ	:	چھوٹا تالاب

© NCERT not to be republished

ڈار	:	ہرنوں کا جھنڈ
مرغوب	:	پسندیدہ
کانس	:	ایک قسم کی لمبی گھاس جو غیر زراعتی زمین پر پیدا ہوتی ہے
روحِ رواں	:	وہ شخص جو کسی کام کی اصل ذمّے داری سنبھالے ہوئے ہو
طباق سا چہرہ	:	چوڑا چکلا چہرہ
نرسُل	:	سرکنڈا، نرکل
پٹیرے	:	ایک قسم کی گھاس
چہے	:	ایک چھوٹی آبی چڑیا
افزائش	:	اضافہ، زیادتی
قہرِ درویش برجانِ درویش	:	غریب کا غصّہ اپنے ہی اوپر نکلتا ہے
منہدم	:	گرا ہوا، مسمار کیا ہوا
یخ بستہ	:	بہت زیادہ ٹھنڈا، برف کی طرح جما ہوا
ہفت خواں	:	کیکاؤس کی رہائی کے لیے رُستم نے ماژندران تک جو راستہ سات دن میں طے کیا اسے ہفت خواں کہا جاتا ہے۔ مراد کٹھن اور مشکل کام

غور کرنے کی بات

- ایک اچھی آپ بیتی میں صرف گزری ہوئی باتوں کا بیان ہی نہیں ہوتا بلکہ اس بیان کو حقیقت پر بھی مبنی ہونا چاہیے۔ اختر الایمان نے اپنی کامیابیوں کے ساتھ ساتھ، اپنی خامیوں اور ناکامیوں کو بھی دیانت داری کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اختر الایمان کی نثر بہت سادہ صاف اور رواں ہے۔ ان کی نثر میں ذرا بھی تصنع اور آرائش نہیں ہے۔
- یہ اقتباس اختر الایمان کی خودنوشت 'اس آباد خرابے میں' کے اس حصّے سے لیا گیا ہے جب مصنف کو گیارہ سال کی عمر میں اپنا گاؤں چھوڑنا پڑا۔ غور کیجیے کہ چوتھے پیراگراف میں مصنف نے اپنے گاؤں کی کتنی اچھی اور سچّی تصویریں پیش کی ہیں۔

© NCERT not to be republished

سوالات

1. خودنوشت یا آپ بیتی کی تعریف بیان کیجیے۔
2. اخترالایمان کسی ایک طرح کی تعلیم پر کیوں نہ جم سکے؟
3. اپنے گاؤں رکڑی کی کیا کیا چیزیں اخترالایمان کو پسند تھیں؟
4. اخترالایمان جب اپنے والد کے ساتھ جگادھری پہنچے تو وہاں کیا منظر تھا؟
5. مدرسے میں رہنے والی بچّی لالی کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا؟

عملی کام

- آپ کو اپنی زندگی کے کچھ ایسے واقعات یاد ہوں گے جن کی یاد آپ کے ذہن میں ہوگی، انھیں یادداشت کی شکل میں لکھیے۔

© NCERT not to be republished

رپورتاژ

رپورتاژ کو انگریزی میں Reportage کہتے ہیں۔ رپورٹ کے لغوی معنی روداد یا خبر کے ہیں۔ خاص طور پر عوام کے سامنے کسی چیز یا واقعے کے بارے میں بیان دینا یا اطلاع دینا۔ رپورتاژ بھی ایک روداد اور اطلاع نامہ ہی ہوتا ہے، لیکن اس کی حیثیت ایک ادبی صنف کی ہے۔ ادبی صنف کے اعتبار سے رپورتاژ کو تاثراتی روداد کا نام دیا جاتا ہے۔ رپورتاژ میں کسی تقریب یا ادبی کانفرنس یا مذاکرے یا جلسے کی کارروائی کی روداد بیان کی جاتی ہے۔ رپورتاژ کا مقصد صرف اطلاع یا خبر دینا نہیں ہوتا، کیوں کہ خبر یا اطلاع کے علم کے بعد پھر اس میں کوئی دل چسپی قائم نہیں رہتی۔ وہ جلد ہی باسی یا بے مصرف سی چیز میں بدل جاتی ہے۔

رپورتاژ لکھنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ تخلیقی مزاج بھی رکھتا ہو۔ اگر وہ صحافی ہے تو اس میں خبر کو افسانہ بنانے کی اہلیت ہونا چاہیے۔ رپورتاژ میں اسلوب بیان کی خاص اہمیت ہے۔

© NCERT not to be republished

کرشن چندر

1914 تا 1977

کرشن چندر بھرت پور میں پیدا ہوئے ۔ ان کا بچپن پونچھ (کشمیر) میں گزرا۔ جہاں ان کے والد بحیثیت ڈاکٹر تعینات تھے۔ انھوں نے وکالت کا امتحان پاس کیا۔ پھر انگریزی میں ایم۔اے کیا۔ کچھ دنوں وہ آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ رہے۔ فلموں کی کشش انھیں بمبئ لے گئی، مگر انھیں فلموں میں زیادہ کامیابی نہ مل سکی۔ انھوں نے قلم کو ہی روزگار کا وسیلہ بنایا۔ کچھ لوگ کرشن چندر پر بسیار نویسی کا الزام بھی لگاتے ہیں۔

کرشن چندر کا شمار اردو کے بڑے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے افسانے کے علاوہ ناول، انشایئے، رپورتاژ، ڈرامے، خاکے، طنزیہ و مزاحیہ مضامین بھی لکھے۔ مگر ان کی اصل پہچان ناول اور افسانے ہی کی وجہ سے ہے۔ کرشن چندر کا پہلا افسانہ ''یرقان'' ہے جو ''ادبی دنیا'' (لاہور) میں 1936 میں شائع ہوا۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''طلسمِ خیال'' 1939 میں شائع ہوا۔ ان کے افسانوں کے تقریباً 32 مجموعے اور 47 ناول شائع ہوئے۔

اپنی تخلیقات میں وہ بہت خوبصورت شاعرانہ زبان استعمال کرتے تھے۔ ان کے یہاں منظر نگاری کے اعلیٰ نمونے بھی پائے جاتے ہیں ۔ انھوں نے ہیئت اور تکنیک کے بہت سے تجربے کیے ہیں ۔ کرشن چندر کا طنز بہت تیکھا ہوتا ہے۔ کرشن چندر کی طنزیہ و مزاحیہ تحریریں بھی بہت مقبول ہوئیں۔ بہت سی ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں ان کے افسانے اور ناولوں کے ترجمے ہوئے ہیں۔ انھیں ''سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ'' اور ''پدم بھوشن'' کا اعزاز دیا گیا۔

© NCERT not to be republished

5257CH12

پودے

جب سردار جعفری اور کرشن چندر نظام کالج سے لوٹے تو فراق اور احتشام اور ڈاکٹر عبدالعلیم لکھنؤ سے تشریف لے آئے تھے۔ یہ سب لوگ کھانے پر بیٹھے عریانی پر بحث کررہے تھے۔ سردار نے آتے ہی قلم ہاتھ میں لے کر ایک تجویز اس امر کے متعلق لکھنا شروع کی اور بحث طویل ہوتی گئی۔ فراق حسن کار ہیں، اس لیے انھیں عریانی سے اتنی نفرت نہیں۔ احتشام کی طبیعت میں نوجوانی کے باوجود اتنا ٹھہراؤ ہے کہ وہ عریانی کو دیکھ کر بدکتے نہیں، برافروختہ نہیں ہوجاتے، صلواتیں سنانے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم کا انداز یہ تھا: ''میاں ابھی تم بچّے ہو، کیا طفلانہ باتیں کررہے ہو''۔ ان کے ہشاش بشاش چہرے پر مسکراہٹ کی لہر دوڑ دوڑ کے کم ہوجاتی تھی۔ وہ اپنی داڑھی اور وضع قطع سے فرانسیسی معلوم ہوتے ہیں اور اپنے درشت اندازِ تکلم سے ہیڈ ماسٹر، اور آگ بگولا ہوتے وقت سو فیصدی کمیونسٹ نظر آتے ہیں۔ اکثر لوگ غلط بات غلط موقعے پر کہتے ہیں۔ یا غلط بات صحیح موقعے پر کہتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر عبدالعلیم کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہمیشہ صحیح بات کہتے ہیں اور ہمیشہ غلط موقعے پر کہتے ہیں۔ چدّرگھاٹ کالج میں انھوں نے تقریر کرتے ہوئے طلبا کے مجمعے میں کالج کے استادوں کو وہ ڈانٹ بتائی کہ بے چارے اب تک یاد کرتے ہوں گے۔ اسی طرح P.E.N. کانفرس کے موقعے پر جب ڈاکٹر مُلک راج آنند نے تجویز پیش کی کہ ہندوستان میں بھی فرانسیسی انسائیکلوپیڈسٹس (ENCYLOPAEDISTIS) کی طرح ایک تحریک جاری کی جائے۔ تو بہت سے لوگوں نے اس انقلابی تجویز کی حمایت کی۔ ان میں ریاست بیکانیر کے وزیر سردار پانیکر بھی شامل تھے، لیکن صرف ایک آدمی کی پرزور مخالفت سے یہ تحریک رہ گئی۔ یہ مخالفت کرنے والا جانتے ہو، کون تھا؟ یہی اپنے ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب! آپ نے اٹھ کر کہا: ''تجویز تو بہت معقول ہے لیکن میں پوچھتا ہوں کہ فرانس میں اس تحریک کے چلانے والوں میں بڑے بڑے لوگ تھے۔ روسو اور والٹیئر۔ یہاں ایسا کون ادیب ہے۔ کون ایسا مفکر ہے۔'' آپ نے پورے مجمعے پر نظر ڈال کر کہا۔ ''مجھے تو آپ لوگوں میں سے ایک آدمی بھی اس پائے کا نظر نہیں آتا۔'' اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا۔ پھر مجمعے میں سے کسی من چلے نے کہا— ''اور کیا ڈائس پر بھی کوئی ایسا آدمی آپ کو نظر نہیں آتا۔''

ڈائس پر سروجنی نائیڈو تشریف فرما تھیں۔ جواہر لعل نہرو تھے ... فلسفہ داں رادھا کرشنن، ہرمین اولڈ اور ... فارسٹر اور ملک راج آنند، احمد شاہ بخاری پطرس اور دوسرے لوگ۔ ڈاکٹر صاحب نے ڈائس پر نگاہ ڈالی۔ سب کی طرف دیکھا اور پھر مجمعے کی

© NCERT not to be republished

طرف مڑ کر کہنے لگے۔ ان میں بھی کوئی نہیں...!

تحریک گر گئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر صاحب سچائی کو اس شدتِ احساس کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور اس پر اس سختی سے کار بند ہوتے ہیں کہ اکثر اوقات ہمدرد بھی مخالف ہو جاتے ہیں لیکن اس کی انھیں کوئی پرواہ نہیں وہ ادیبوں کے مہا تما گاندھی ہیں لیکن ذرا عدم تشدد کے قائل نہیں اور اگر کبھی ہندوستان میں ایسا قانون نافذ ہوا کہ ادیبوں کو ان کی فکری، ذہنی یا خارجی غلطیوں کی سزا ملنے لگی تو اس احتساب کا محکمہ ڈاکٹر صاحب کے ہی سپرد ہوگا۔ ان کی صاف گوئی سے بہت سے لوگ ان سے گھبراتے ہیں لیکن اس میں ان کی عظمت ہے اور اگر اس صنف میں کوئی ان سے ٹکر لے سکتا ہے تو وہ حسرت موہانی ہیں جو خوش قسمتی سے اس کانفرنس میں تشریف رکھتے تھے اور بلا ناغہ اس کے ہر جلسے میں شرکت کرتے رہے۔ چنانچہ جب ترقی پسند ادیبوں کی طرف سے عریانی کے خلاف قرارداد پیش کی گئی تو اس کی مخالفت کرنے والے مولانا حسرت موہانی تھے اور قاضی عبد الغفار۔ مزے کی بات یہ تھی کہ نوجوان عریانی کے خلاف تحریک پیش کر رہے تھے اور بزرگ اس تحریک کی مخالفت کر رہے تھے۔ کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ اس طرح نوجوان اذہان کی قوتیں مسلوب ہو جائیں گی اور ان کی تخیلی نمو رک جائے گی۔ مولانا حسرت موہانی کی پر زور تقریر سے قرارداد مسترد کر دی گئی۔ سبطے بے حد ناخوش تھا۔ کہنے لگا۔

''اماں، مولانا کا ہمیشہ یہی رول رہا ہے۔ وہ جہاں گئے لوگوں کو مصیبت میں ڈالتے گئے۔ جب کانگریس میں تھے تو ہوم رول کے دنوں میں آزادی کا ذکر کر کے کانگریس ہائی کمانڈ کو خائف کیا کرتے تھے اور جب کانگریس نے لاہور کانفرس کے موقعے پر مکمل آزادی کی قرارداد منظور کر لی تو آپ نے اشتراکیت کی پخ لگا دی اور کانگریس سے ایسے ناخوش ہوئے کہ مسلم لیگ میں چلے گئے۔ وہاں پہنچے ہیں تو اب بے چارے شریف خان بہادروں کو بغاوت پر اکسا رہے ہیں اور مکمل آزادی کا ریزولیوشن پاس کیے دے رہے ہیں۔ ہر جگہ مصیبت میں ڈالتے ہیں، یہ لوگوں کو۔ بھئی اب اچھا بھلا یہ ریزولیوشن پاس ہو رہا تھا.... خیر... ہٹاؤ اب اس قصّے کو۔'' یہ کہہ کر وہ رک گیا اور اس کے چہرے پر ہزاروں درد کی لکیریں یکا یک معدوم ہو گئیں اور پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ مگر بھئی۔ یہ خوب ہیں مولانا چٹان ہیں۔ بس کسی کی نہیں سنیں گے۔ اپنی جگہ سے کبھی نہیں ہٹیں گے۔

دوپہر کو پریم چند سوسائٹی کا افتتاح تھا۔ حسین ساگر میں جو کلب ہے وہاں دعوت بھی تھی۔ ادیبوں کو کشتیوں میں سوار کر کے کلب میں پہنچایا گیا۔ درحالیکہ ایک راستہ خشکی سے بھی جاتا تھا۔ غالباً موٹر بوٹ کی نمائش مقصود تھی۔ کلب کی عمارت جھیل میں تعمیر کی گئی ہے۔ کوئی پچاس کے قریب ملازم ہوں گے۔ آٹھ کورس کا کھانا۔ اس دعوت پر اتنا صرف کیا گیا تھا کہ غالباً پریم چند کو اپنی زندگی

میں اتنی رائلٹی نہ ملی ہوگی۔ یورپ میں جب ادیب زندہ ہوتا ہے تو اس کی قدر ہوتی ہے۔ ہندوستان میں مرنے کے بعد اسے پوچھا جاتا ہے۔ چنانچہ آج پریم چند سوسائٹی کا افتتاح تھا۔ قاضی عبدالغفار تقریر کررہے تھے۔ اور مرغن کھانے دعوت میں شامل تھے۔ جھیل کے منظر سے ادیب لطف اندوز ہورہے تھے۔ قاضی عبدالغفار کی شخصیت پر متانت کا ایک دبیز پردہ پڑا ہوا ہے لیکن اتنا دبیز بھی نہیں کہ ان کی جبلی خوش طبعی اس متانت کے اندر سے جھلک نہ اُٹھے۔ متانت ہے لیکن بوجھل نہیں ہے۔ خوش طبعی ہے لیکن کھُل کر نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کسی چیز نے، کسی خاص واقعے نے، یا کسی خاص ماحول نے، ان کے ذہن کے، ان کے فکر کے، ان کی فطری صلاحیت کے دو ٹکڑے کردیے ہیں۔ وہ اس پر بھی مجبور ہیں۔ اس پر بھی دونوں رنگ ایک ہی شخصیت میں جھلکتے نظر آتے ہیں۔ پیرس کی رنگینی بھی ہے، عالمانہ زہد بھی ہے، شگفتہ انشا پردازی بھی ہے۔ اور فکری ٹھہراؤ بھی۔ لباس میں امارت کی جھلک ہے اور گفتگو میں حلم کی چاشنی۔ تیور جاگیردارانہ ہیں اور ذہن باغیانہ، قاضی صاحب اک ایسے نوجوان جسے عرصے سے کسی نے گُدگُدایا نہ ہو لیکن خود اس کے دل میں شوخیاں چٹکیاں لے رہی ہوں۔ کاش کوئی مصنّف ''لیلیٰ کے خطوط'' کو گُدگُدا دے۔ اس طرح کہ وہ بھری محفل میں، یاروں کی محفل میں نہیں، ہزاروں لاکھوں معمولی آدمیوں کی محفل میں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ یہ گُدگُدی ایک بہت بڑے شاہکار کا پیش خیمہ ہوگی۔

(کرشن چندر)

مشق

لفظ و معنی

عریانی	:	ننگا پن، برہنگی
حسن کار	:	حسن کی تخلیق کرنے والا، آرائش کرنے والا
برافروختہ	:	غصیلا، ناراض، بھڑکا ہوا
صلواتیں سنانا	:	برا بھلا کہنا
طفلانہ	:	بچکانہ

© NCERT not to be republished

درشت	:	کرخت، کھردرا
اندازِ تکلم	:	بولنے کا انداز
عدم تشدد	:	خود کو ظلم اور زیادتی سے علاحدہ رکھنا، اہنسا
احتساب	:	حساب کرنا، جائزہ لینا
مسلوب	:	سلب کیا گیا، چھینا ہوا
تخیلی نمو	:	فکری ارتقا، ذہنی نشو ونما
خائف	:	خوف زدہ
ریزولیوشن	:	قرارداد
معدوم	:	مٹایا گیا
درحالیکہ	:	اس صورت میں
رائلٹی	:	مصنف کو اپنی تصنیف پر ناشر کی طرف سے ملنے والی رقم
متانت	:	سنجیدگی
دبیز	:	موٹا (کسی کپڑے یا کاغذ کے لیے بولا جاتا ہے)
جبلّی	:	فطری
زہد	:	پرہیزگاری
حلم	:	بردباری

غور کرنے کی بات

- 'پودے' دراصل انجمن ترقی پسند مصنفین کی حیدرآباد کانفرنس کی روداد ہے۔ اس روداد میں کرشن چندر نے یہ بتایا ہے کہ اس انجمن نے کس طرح ہمارے ادب میں انسان دوستی اور حقیقت پسندی کی ایک نئی روایت کا پودا لگایا۔
- دانشوروں کی مجلس میں جب کوئی تجویز منظوری کے لیے پیش کی جاتی ہے تو کچھ لوگ اس کی حمایت کرتے ہیں اور کچھ مخالفت۔ اس طرح اس تجویز کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا جاتا ہے۔ یہاں مصنّف نے یہ بتایا ہے کہ ملک راج آنند کی پیش کردہ تجویز، کئی لوگوں کی حمایت کے باوجود، ڈاکٹر عبدالعلیم کی مخالفت کے باعث پاس نہ ہوسکی۔

© NCERT not to be republished

سوالات

1. ڈاکٹر عبدالعلیم کے کردار کی کیا خصوصیات بیان کی گئی ہیں؟
2. ملک راج آنند کی پیش کردہ تجویز کیوں منظور نہ ہو سکی؟
3. ادیبوں کے احتساب کا محکمہ ڈاکٹر علیم صاحب کے پاس ہی ہونے کی کیا وجہ بتائی گئی ہے؟
4. مولانا حسرت موہانی کے بارے میں کس رائے کا اظہار کیا گیا ہے؟
5. قاضی عبدالغفار کے کردار کی کیا خصوصیات بیان کی گئی ہیں؟ وضاحت کیجیے۔

عملی کام

- آپ نے اپنے اسکول میں کئی جلسے اور تقریبات دیکھی ہوں گی۔ ایسی کسی تقریب یا جلسے کے بارے میں ایک رپورتاژ لکھیے۔

© NCERT not to be republished

انشائیہ

لفظ انشا اردو میں کئی طرح سے استعمال ہوتا ہے۔انشائیہ بھی اسی لفظ سے بنا ہے۔محققین کا خیال ہے کہ لفظ Essay عربی لفظ ''السّعی'' سے نکلا ہے جو لفظ انشا کا بدل ہے۔'السّعی' فرانسیسی میں Essai اور انگریزی میں Essay بنا۔

ابتدا میں مضمون نگاری اور انشائیہ نگاری میں زیادہ فرق نہیں تھا،مگر رفتہ رفتہ ان میں فرق پیدا ہوتا گیا، یہاں تک کہ انشائیہ ایک علاحدہ صنف قرار پائی۔انشائیہ نگار اپنے مخصوص ذاتی مشاہدات اور تاثرات کو بے باکی اور بے تکلفی سے بیان کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انشائیہ میں سنجیدہ اور غیر سنجیدہ موضوعات سے متعلق خیال کے تمام مرحلے خوش طبعی کے ساتھ طے کیے جاتے ہیں۔ یہ بات میں بات پیدا کرنے کا فن ہے۔انشائیہ نگار مفہوم سے خالی گفتگو میں بھی معنی پیدا کر دیتا ہے لیکن کبھی کبھی اس کے برعکس بھی ہوتا ہے۔اختصار اس کی پہچان ہے۔ اس میں مزاح یا ٹھٹھول کی جگہ ہلکی پھلکی زیرِ لب ہنسی پنہاں ہوتی ہے۔خیال آفرینی اس کی ایک اہم خصوصیت ہے۔

اردو میں انشائیے کی ابتدا سر سید احمد کے رسالے ''تہذیب الاخلاق'' سے ہوتی ہے۔ مولوی نذیر احمد اور ذکاء اللہ کے بعد ''اودھ پنچ'' اور ''مخزن'' نے اسے فروغ دیا۔میر ناصر علی، سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش، سجاد انصاری ، نیاز فتح پوری، مہدی افادی، فرحت اللہ بیگ، قاضی عبدالغفار، پطرس بخاری، سید محفوظ علی بدایونی، خواجہ حسن نظامی، رشید احمد صدیقی اور مشتاق احمد یوسفی نے اس صنف کو مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

© NCERT not to be republished

خواجہ حسن نظامی

1878 تا 1955

خواجہ حسن نظامی دہلی میں پیدا ہوئے۔کم عمری میں ہی والد اور والدہ کا انتقال ہوگیا۔بڑے بھائی نے پرورش کی۔عربی وفارسی کی تعلیم دہلی ہی میں حاصل کی۔کتابوں کے مطالعے اورمضمون نویسی کا شوق بچپن ہی سے تھا۔پہلے اخبارات میں چھوٹے چھوٹے مضامین لکھے۔بعد میں تحریروتصنیف ہی اُن کا مشغلہ بن گیا۔انھوں نے بہت سی چھوٹی بڑی کتابیں لکھیں۔ان میں انشائیے، سفرنامے، روزنامچے، قلمی چہرے اور نوحے سبھی کچھ شامل ہیں۔کئی رسالے بھی نکالے جن میں ''مُنادی'' کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔

خواجہ حسن نظامی ایک خاص طرزِ تحریر کے مالک ہیں۔ان کی نثر میں ادبیت،علمیت اور روحانیت کی عجیب وغریب آمیزش نظر آتی ہے۔ان کا دل کش اسلوب معمولی واقعات اور روزمرّہ کی چیزوں کو بھی غیر معمولی بنا دیتا ہے۔بے تکلفی، سادگی اور لطیف طنز ان کی نثر کی نمایاں خصوصیات ہیں۔جن میں دہلی کا روز مرہ اور محاورہ مزید لطف پیدا کر دیتا ہے۔مُرقع نگاری اور منظرکشی میں بھی انھیں مہارت حاصل ہے۔وہ اپنے چھوٹے چھوٹے جملوں میں بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے تھے۔

ان کی تصانیف میں ''سی پارۂ دل''،'' کانا باتی''، ''چٹکیاں اور گدگدیاں''، ''بہادر شاہ کا روزنامچہ''، ''بیگمات کے آنسو''، ''غدر کے صبح وشام''،'' آپ بیتی'' اور'' روزنامچۂ حسن نظامی'' خاص طور پر مشہور ہیں۔ زیرِ نظر انشائیہ ''مچھّر'' ان کے اسلوبِ تحریر کی نمائندگی کرتا ہے۔

© NCERT not to be republished

5257CH13

مچھّر

یہ بِھنبھناتا ہوا ننّھا سا پرندہ آپ کو بہت ستاتا ہے۔ رات کی نیند حرام کردی ہے۔ ہندو، مسلمان، عیسائی یہودی سب بالاتفاق اس سے ناراض ہیں۔ ہر روز اس کے مقابلے کے لیے مہمیں تیار ہوتی ہیں، جنگ کے نقشے بنائے جاتے ہیں مگر مچھرّوں کے جنرل کے سامنے کسی کی نہیں چلتی۔ شکست پر شکست ہوئی چلی جاتی ہے اور مچھرّوں کا لشکر بڑھا چلا آتا ہے۔

اتنے بڑے ڈیل ڈول کا انسان ذرا سے بھُنگے پر قابو نہیں پاسکتا۔ طرح طرح کے مسالے بھی بناتا ہے کہ ان کی بُو سے مچھر بھاگ جائیں۔ لیکن مچھّر اپنی یورش سے باز نہیں آتے۔ آتے ہیں اور نعرے لگاتے ہوئے آتے ہیں۔ بے چارا آدم زاد حیران رہ جاتا ہے اور کسی طرح ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

امیر، غریب، ادنیٰ، اعلیٰ، بچے، بوڑھے، عورت، مرد، کوئی اس کے وار سے محفوظ نہیں۔ یہاں تک کہ آدمی کے پاس رہنے والے جانوروں کو بھی ان کے ہاتھ سے ایذا ہے۔ مچھر جانتا ہے کہ دشمن کے دوست بھی دشمن ہوتے ہیں۔ ان جانوروں نے میرے دشمن کی اطاعت کی ہے تو میں ان کو بھی مزا چکھاؤں گا۔

آدمیوں نے مچھروں کے خلاف ایجی ٹیشن کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ہر شخص اپنی سمجھ اور عقل کے موافق مچھروں پر الزام رکھ کر لوگوں میں ان کے خلاف جوش پیدا کرنا چاہتا ہے مگر مچھر اس کی کچھ پروا نہیں کرتا۔

© NCERT not to be republished

طاعون نے گڑبڑ مچائی تو انسان نے کہا کہ طاعون مچھّر اور پسّو کے ذریعے سے پھیلتا ہے۔ان کو فنا کر دیا جائے تو یہ ہولناک وبا دور ہوجائے گی۔ملیریا پھیلا تو اس کا الزام بھی مچھر پر عائد ہوا۔اس سرے سے اس سرے تک کالے گورے آدمی غل مچانے لگے کہ مچھروں کو مٹادو، مچھروں کو کچل ڈالو، مچھروں کو تہس نہس کردو اور ایسی تدبیریں نکالیں جن سے مچھروں کی نسل ہی منقطع ہوجائے۔

مچھر بھی یہ سب باتیں دیکھ رہا تھا اور سن رہا تھا اور رات کو ڈاکٹر صاحب کی میز پر رکھے ہوئے ''پانیر''(Pioneer) کو آکر دیکھتا اور اپنی برائی کے حروف پر بیٹھ کر اُس خون کی ننھی ننھی بوندیں ڈال جاتا جو انسان کے جسم سے یا خود ڈاکٹر صاحب کے جسم سے چوس کر لایا تھا۔گویا اپنے فائدہ کی تحریر سے انسان کی ان تحریروں پر شوخیانہ ریمارک لکھ جاتا کہ میاں تم میرا کچھ بھی نہیں کر سکتے۔

انسان کہتا ہے کہ مچھر بڑا کم ذات ہے۔کوڑے، کرکٹ، میل کچیل سے پیدا ہوتا اور گندی موریوں میں زندگی بسر کرتا ہے اور بزدلی تو دیکھو اس وقت حملہ کرتا ہے جب کہ ہم سوجاتے ہیں۔سوتے پر وار کرنا، بے خبر کے چرکے لگانا مردانگی نہیں ہے۔صورت تو دیکھو کالا بھُتنا، لمبے لمبے پاؤں، بے ڈول چہرہ، اس شان وشوکت کا وجود اور آدمی جیسے گورے چِٹّے، خوش وضع کی دشمنی؛ بے عقلی اور جہالت اسی کو کہتے ہیں۔

مچھر کی سنو تو وہ آدمی کو کھری کھری سناتا ہے اور کہتا ہے کہ جناب ہمّت ہے تو مقابلہ کیجیے۔ذات صفات نہ دیکھیے ۔ میں کالا سہی، بدرونق سہی، مگر یہ تو کہیے کہ کس دلیری سے آپ کا مقابلہ کرتا ہوں اور کیوں کر آپ کی ناک میں دم کرتا ہوں۔

یہ الزام سراسر غلط ہے کہ بے خبری میں آتا ہوں اور سوتے میں ستاتا ہوں۔یہ تو تم اپنی عادت کے موافق سراسر ناانصافی کرتے ہو۔حضرت میں تو کان میں آکر ''اَلٹی میٹم'' دے دیتا ہوں کہ ہوشیار ہوجاؤ اب حملہ ہوتا ہے۔تم ہی غافل رہو تو میرا کیا قصور۔زمانہ خود فیصلہ کردے گا کہ میدانِ جنگ میں کالا بھتنا، لمبے لمبے پاؤں والا بیڈول فتح یاب ہوتا ہے یا گورا چٹا آن بان والا۔

میرے کارناموں کی شاید تم کو خبر نہیں کہ میں نے اس پردۂ دنیا پر کیا کیا جوہر دکھائے ہیں۔اپنے بھائی نمرود کا قصّہ بھول گئے جو خدائی کا دعویٰ کرتا تھا اور اپنے سامنے کسی کی حقیقت نہ سمجھتا تھا؟ کس نے اس کا غرور توڑا؟ کون اس پر غالب آیا؟ کس کے سبب اس کی خدائی خاک میں ملی؟ اگر آپ نہ جانتے ہوں تو اپنے ہی کسی بھائی سے دریافت کیجیے یا مجھ سے سنیے کہ میرے ہی ایک بھائی مچھر نے اس سرکش کا خاتمہ کیا تھا۔

اور تم تو ناحق بگڑتے ہو اور خواہ مخواہ اپنا دشمن تصور کیے لیتے ہو۔میں تمھارا مخالف نہیں ہوں۔اگر تم کو یقین نہ آئے تو اپنے کسی شب بیدار صوفی بھائی سے دریافت کرلو، دیکھو وہ میری شان میں کیا کہے گا۔کل ایک شاہ صاحب عالمِ ذوق میں اپنے ایک

© NCERT not to be republished

مرید سے فرما رہے تھے کہ میں مچھر کی زندگی کو دل سے پسند کرتا ہوں۔ دن بھر بے چارہ خلوت خانہ میں رہتا ہے۔ رات کو، جو خدا کی یاد کا وقت ہے۔ باہر نکلتا ہے اور پھر تمام شب تسبیح و تقدیس کے ترانے گایا کرتا ہے۔ آدمی غفلت میں پڑے سوتے ہیں تو اس کو ان پر غصہ آتا ہے۔ چاہتا ہے کہ یہ بھی بیدار ہو کر اپنے مالک کے دیے ہوئے اس سہانے خاموش وقت کی قدر کرے اور حمد و شکر کے گیت گائے۔ اس لیے پہلے ان کے کان میں جا کر کہتا ہے اٹھو میاں اٹھو جاگو جاگنے کا وقت ہے۔ سونے کا اور ہمیشہ سونے کا وقت ابھی نہیں آیا۔ جب آئے گا تو بے فکر ہو کر سونا۔ اب تو ہوشیار رہنے اور کچھ کام کرنے کا موقع ہے مگر انسان اس سریلی نصیحت کی پروا نہیں کرتا اور سوتا رہتا ہے تو مجبور ہو کر غصہ میں آجاتا ہے اور اس کے چہرے اور ہاتھ پاؤں پر ڈنک مارتا ہے۔ پر واہ رے انسان، آنکھیں بند کیے ہوئے ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور بے ہوشی میں بدن کو کھجا کر پھر سو جاتا ہے اور جب دن کو بیدار ہوتا ہے تو بے چارے مچھر کو صلواتیں سناتا ہے کہ رات بھر سونے نہیں دیا۔ کوئی اس دروغ گو سے پوچھے کہ جناب عالی گے سکنڈ جاگے تھے جو ساری رات جاگتے رہنے کا شکوہ ہو رہا ہے۔

شاہ صاحب کی زبان سے یہ عارفانہ کلمات سن کر میرے دل کو بھی تسلّی ہوئی کہ غنیمت ہے ان آدمیوں میں بھی انصاف والے موجود ہیں بلکہ میں دل میں شرمایا کہ کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے کہ شاہ صاحب مصلّے پر بیٹھے وظیفہ پڑھا کرتے ہیں اور میں اُن کے پیروں کا خون پیا کرتا ہوں۔ یہ تو میری نسبت، ایسی اچھی اور نیک رائے دیں اور میں ان کو تکلیف دوں۔ اگرچہ دل نے یہ سمجھایا کہ تو کاٹتا تھوڑی ہے، قدم چومتا ہے اور ان بزرگوں کے قدم چومنے ہی کے قابل ہوتے ہیں لیکن اصل یہ ہے کہ اس سے میری ندامت دور نہیں ہوئی اور اب تک میرے دل میں اس کا افسوس باقی ہے۔

سو......اگر سب انسان ایسا طریقہ اختیار کر لیں جیسا کہ صوفی صاحب نے کیا تو یقین ہے کہ ہماری قوم انسان کو ستانے سے خود بخود باز آجائے گی۔ ورنہ یاد رہے کہ میرا نام مچھر ہے، لطف سے جینے نہ دوں گا۔

(خواجہ حسن نظامی)

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی

یورِش	:	حملہ
آدم زاد	:	آدم کی اولاد، انسان
ادنیٰ	:	چھوٹا
اعلیٰ	:	بڑا
اطاعت	:	حکم ماننا
پائنیر(Pioneer)	:	مشہور انگریزی اخبار
چرکا لگانا	:	زخم لگانا، نقصان پہنچانا
سرکشی	:	بغاوت، حکم نہ ماننا
شب بیدار	:	راتوں کو جاگ کر عبادت کرنے والا
عالمِ ذوق	:	دل و دماغ کی ایک خاص کیفیت
خلوت خانہ	:	تنہائی کی جگہ
تسبیح	:	اللہ کی پاکی بیان کرنا
تقدس	:	بزرگی، پاکی
دروغ گو	:	جھوٹا
شکوہ	:	شکایت
عارفانہ کلمات	:	معرفت کی باتیں، خدا رسیدہ بزرگوں کی باتیں
ندامت	:	شرمندگی

© NCERT not to be republished

غور کرنے کی بات

- اس انشائیے میں مچھر کے ذریعے انسان کو کئی نصیحت آمیز باتوں کی طرف توجّہ دلائی گئی ہے۔ اگر وہ نصیحتیں براہِ راست کی جاتیں تو ان کی تاثیر ختم ہوجاتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ بالواسطہ گفتگو اور لطیف طنز سے بیان کا لطف دوبالا ہوجاتا ہے۔
- اس سبق میں کئی محاورے استعمال ہوئے ہیں مثلاً : مزا چکھانا، کھری کھری سنانا، غرور توڑنا، ناک میں دم کرنا، محاوروں کے استعمال سے تحریر میں بات چیت کا انداز پیدا ہوجاتا ہے۔
- اس سبق سے الفاظ کے مندرجہ ذیل جوڑوں کو دیکھیے :

کوڑا کرکٹ، میل کچیل، گورا چٹّا، تہس نہس، آن بان

ان میں سے ہر جوڑے کا دوسرا لفظ، پہلے لفظ کے ہم معنی ہے اور اس کی تاکید کے لیے لایا گیا ہے۔ ایسے تاکیدی الفاظ کو اصطلاح میں تابع موضوع کہتے ہیں۔ تابع کی دوسری قسم تابع مہمل کہلاتی ہے۔ اس میں جوڑے کا دوسرا تاکیدی لفظ مہمل یعنی بے معنی ہوتا ہے۔ مثلاً: چادر وادر، تکیہ وکیہ، بستر وستر، وغیرہ۔

سوالات

1. مضمون نگار نے مچھر کا حلیہ کن الفاظ میں بیان کیا ہے؟ لکھیے۔
2. اس سبق میں انسان کو کیا نصیحتیں کی گئی ہیں؟ اپنے الفاظ میں لکھیے۔
3. مصنف نے مچھروں کے کس عمل کو شوخیانہ ریمارک قرار دیا ہے؟
4. ’’مچّھر جانتا ہے کہ دشمن کے دوست بھی دشمن ہوتے ہیں‘‘ اس جملے کے ذریعے مصنف ہمیں کیا بتانا چاہتا ہے؟

عملی کام

- اس سبق میں مچھر اور انسان کے درمیان مکالمے کے کچھ اقتباسات اپنی کاپی میں نقل کیجیے۔
- اس مضمون میں جو محاورے آئے ہیں ان میں سے پانچ کا اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔
- خواجہ حسن نظامی کے ذریعے لکھے ہوئے انشائیوں کا مطالعہ کیجیے۔
- انشائیے میں آئے ہوئے انگریزی الفاظ لکھیے۔

© NCERT not to be republished

طنز ومزاح

طنز ومزاح، ادب میں باقاعدہ کوئی صنف نہیں ہے بلکہ بیان کے ایک اسلوب کا نام ہے۔ اردو ادب میں طنز ومزاح کو عموماً اظہار کا ایک ہی اسلوب سمجھ لیا جاتا ہے لیکن دراصل ایسا نہیں ہے۔ طنز اور مزاح دونوں کی الگ الگ پہچان ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اردو کے بیشتر لکھنے والوں نے طنز ومزاح کو ایک مرکّب کے طور پر پیش کیا ہے اس لیے دونوں کو ایک ہی سمجھا جانے لگا۔

اُردو ادب میں طنز ومزاح کی روایت بہت پرانی ہے۔ جعفر زٹلّی کو اردو طنز ومزاح کا پہلا نمائندہ شاعر کہا جاتا ہے۔ وہ سترھویں صدی کے ایک باغی شاعر تھے۔ ان کے مزاح میں پھکّڑ پن نمایاں ہے۔ اٹھارویں صدی میں میؔر اور سوؔدا کے یہاں بھی ہجو یہ انداز ملتا ہے۔ طنز ومزاح کے اعلیٰ ترین نمونے سب سے پہلے ہمیں سوؔدا کے یہاں اور اس کے بعد 19 ویں صدی میں غالبؔ کے یہاں دکھائی دیتے ہیں۔ اس روایت کو سب سے زیادہ ترقی منشی سجّاد حسین کے اخبار ''اودھ پنچ'' کے ذریعے ملی۔ سیاسی اور معاشرتی طنز کو ''حلقۂ اودھ پنچ'' نے غیر معمولی ترقی دی۔ شاعری میں طنز ومزاح کے لحاظ سے سب سے بڑا نام اکبرالٰہ آبادی کا ہے۔ نثر میں منشی سجّاد حسین کے علاوہ پنڈت رتن ناتھ سرشار کا نام خاص اہمیت رکھتا ہے۔

20 ویں صدی کے نثر نگاروں میں طنز ومزاح کی روایت جن لوگوں نے آگے بڑھائی ہے ان میں فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، مرزا عظیم بیگ چغتائی، پطرس بخاری، شوکت تھانوی، ملاّ رموزی، کنھیّا لال کپور، ابنِ انشا، شفیق الرحمٰن، فکر تونسوی، مشفق خواجہ، یوسف ناظم، کرنل محمد خاں اور مجتبیٰ حسین وغیرہ معروف ہیں۔ موجودہ دور میں اردو طنز ومزاح کا سب سے بڑا نام مشتاق احمد یوسفی کا ہے۔

کنھیّا لال کپور

1910 تا 1980

کنھیا لال کپور لاہور میں پیدا ہوئے۔ وہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور انگریزی کے استاد مقرر ہوگئے۔ ملک کی تقسیم کے بعد ہندوستان آ گئے۔ یہاں گورنمنٹ کالج، موگا (پنجاب) میں پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوئے اور یہیں ان کی وفات ہوئی۔ وہ ہندوستان آنے سے پہلے ہی مشہور ہو چکے تھے۔ انھوں نے اپنے بعض مضامین میں خاص طرح کی نثر اور شاعری کے علاوہ کئی عام انسانی رویّوں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ انھیں پیروڈی لکھنے میں خاص مہارت حاصل تھی۔ طنز و مزاح ان کا خاص میدان ہے۔

''نوک نشتر''، ''بال و پر''، ''نرم گرم''، ''گردِ کارواں''، ''نازک خیالیاں''، ''نئے شگوفے''، ''سنگ و خشت''، ''چنگ و رباب''، ''شیشہ و تیشہ'' اور ''کامریڈ شیخ چلّی'' ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ کنھیّا لال کپور سماجی ناہمواریوں کی بہت جاندار تصویریں پیش کرتے ہیں جن میں ایک احتجاجی پہلو بھی ہوتا ہے۔ اپنے طنز کو آزمانے میں وہ کسی رو رعایت کے قائل نہیں ہیں۔ شاید اسی لیے ان کے طنز و مزاح میں جرأت اور بے باکی ان کی خاص پہچان ہے۔ ان کے کئی انشائیے بہت مقبول ہوئے، جن میں برج بانو، گھر یاد آتا ہے، زندہ باد، اردو افسانہ نویسی کے چند نمونے، مقبولِ عام فلمی سین، چار ملنگوں کی داستان، چوپٹ راجا سبز باغ اور جانشین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس کتاب میں کنھیّا لال کپور کا جو مضمون شامل ہے اس میں انھوں نے جدید شاعری اور خاص طور پر آزاد شاعری کو لطیف طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ غالبؔ کے ساتھ مجلس میں شریک سبھی شاعر، کنھیّا لال کپور کے مشہور اور معتبر ہم عصر ہیں مگر انھوں نے غالبؔ کے ذریعے ان کی شاعری میں پوشیدہ مزاحیہ پہلو واضح کر کے پڑھنے والوں کے لیے دل چسپی کا سامان فراہم کیا ہے۔

© NCERT not to be republished

5257CH14

غالبؔ جدید شعرا کی ایک مجلس میں

(دورِجدید کے شعرا کی ایک مجلس میں مرزا غالبؔ کا انتظار کیا جارہا ہے۔ اس مجلس میں تقریباً تمام جلیل القدر شعرا تشریف فرما ہیں۔ مثلاً م ن ارشد، ہیراجی، ڈاکٹر قربان حسین خالص، میاں رقیق احمد خوگر، راجہ مہر علی خاں، پروفیسر غیظ احمد غیظ، بکرما جیت ورما، عبدالحی نگاہ وغیرہ وغیرہ۔ یکا یک مرزا غالبؔ داخل ہوتے ہیں۔ ان کی شکل وصورت بعینہٖ وہی ہے جو مولانا حالیؔ نے یادگارِ غالب میں بیان کی ہے، ان کے ہاتھ میں دیوانِ غالبؔ کا ایک نسخہ ہے۔ تمام شعرا کھڑے ہوکر آداب بجالاتے ہیں)

غالبؔ : حضرات میں آپ کا نہایت شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے جنّت میں دعوت نامہ بھیجا اور اس مجلس میں مدعو کیا۔ میری مدّت سے آرزو تھی کہ دورِ جدید کے شعرا سے شرفِ نیاز حاصل کروں۔

ایک شاعر : یہ آپ کی ذرّہ نوازی ہے وگرنہ:

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

© NCERT not to be republished

غالبؔ : رہنے بھی دیجیے، اس بے جا تعریف کو، من آنم کہ من دانم

دوسرا شاعر : تشریف رکھیے گا۔ کہیے جنت میں خوب گزرتی ہے؟ آپ تو فرمایا کرتے تھے ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن۔

غالبؔ : بھئی جنت بھی خوب جگہ ہے جب سے وہاں گیا ہوں، ایک شعر بھی موزوں نہیں کر سکا۔

دوسرا شاعر : تعجّب ہے۔ جنت میں آپ کو کافی فراغت ہے اور پھر ہر ایک چیز میسّر ہے۔ پینے کو شراب، انتقام لینے کو پری زاد ـــــ اور اس پر یہ فکر کوسوں دور کہ:

آپ کا نوکر اور کھاؤں ادھار آپ کا بندہ اور پھروں ننگا

باوجود اس کے آپ کچھ لکھ...

تیسرا شاعر : (بات کاٹ کر) سنائیے اقبالؔ کا کیا حال ہے؟

غالبؔ : وہی جو اس دنیا میں تھا۔ دن رات خدا سے لڑنا جھگڑنا، وہی پرانی بحث:
مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے، یا میرا

پہلا شاعر : میرے خیال میں وقت کافی ہو گیا ہے، اب مجلس کی کارروائی شروع کرنی چاہیے۔

دوسرا شاعر : میں کرسیِ صدارت کے لیے جناب م ن ارشد کا نام تجویز کرتا ہوں۔

تیسرا شاعر : اور میں تائید کرتا ہوں۔

(ارشد صاحب کرسیِ صدارت پر بیٹھنے سے پہلے حاضرینِ مجلس کا شکریہ ادا کرتے ہیں)

م ن ارشد : میرے خیال میں ابتدا مرزا کے کلام سے ہونی چاہیے .... میں نہایت ادب سے مرزا موصوف سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنا کلام پڑھیں۔

غالبؔ : بھئی جب ہمارے سامنے شمع لائی جائے گی تو ہم بھی کچھ پڑھ کر سنا دیں گے۔

م ن ارشد : معاف کیجیے گا۔ مرزا اس مجلس میں شمع وغیرہ کسی کے سامنے نہیں لائی جائے گی۔ شمع کے بجائے یہاں پچاس کینڈل پاور کا لیمپ ہے، اس کی روشنی میں ہر ایک شاعر اپنا کلام پڑھے گا۔

غالبؔ : بہت اچھا صاحب تو غزل سنیے گا۔

© NCERT not to be republished

باقی شعرا : ارشاد۔

غالبؔ : عرض کیا ہے:

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمھارے نام کے

(باقی شعرا ہنستے ہیں۔مرزا حیران ہوکر ان کی جانب دیکھتے ہیں)

غالبؔ : اجی صاحب یہ کیا حرکت ہے؟ نہ داد نہ تحسین اس بے موقع خندہ زنی کا مطلب؟

ایک شاعر : معاف کیجیے گا مرزا ہمیں یہ شعر کچھ بے معنی سا معلوم ہوتا ہے۔

غالبؔ : بے معنی؟

ہیرا جی : دیکھیے نا مرزا، آپ فرماتے ہیں خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو۔اگر مطلب کچھ نہیں تو خط لکھنے کا فائدہ ہی کیا، اگر آپ صرف معشوق کے نام ہی کے عاشق ہیں تو تین پیسے کا خط برباد کرنا ہی کیا ضرور، سادا کاغذ پر اس کا نام لکھ لیجیے۔

ڈاکٹر قربان حسین خالص : میرے خیال میں اگر یہ شعر اس طرح لکھا جائے تو زیادہ موزوں ہے۔

خط لکھیں گے کیونکہ چھٹی ہے ہمیں دفتر سے آج
اور چاہے بھیجنا ہم کو پڑے بیرنگ ہی
پھر بھی تم کو خط لکھیں گے ہم ضرور
چاہے مطلب کچھ نہ ہو
جس طرح سے میری اک اک نظم کا
کچھ بھی تو مطلب نہیں
خط لکھیں گے کیونکہ الفت ہے ہمیں
میرا مطلب ہے محبت ہے ہمیں
یعنی عاشق ہیں تمھارے نام کے

غالبؔ : یہ تو اس طرح معلوم ہوتا ہے جیسے آپ میرے اس شعر کی ترجمانی کر رہے ہیں۔

© NCERT not to be republished

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

ہیرا جی : جنوں! جنوں کے متعلق مرزا میں نے کچھ عرض کیا ہے اگر اجازت ہو تو کہوں۔

غالبؔ : ہاں ہاں بڑے شوق سے

ہیرا جی : جنوں ہوا جنوں ہوا
مگر کہاں جنوں ہوا
کہاں ہوا وہ کب ہوا
ابھی ہوا یا اب ہوا
نہیں ہوں میں یہ جانتا
مگر جدید شاعری
میں کہنے کا جو شوق ہے
تو بس یہی ہے وجہ کہ
دماغ میرا چل گیا
یہی سبب ہے جو مجھے
جنوں ہوا جنوں ہوا

غالبؔ : (ہنسی کو روکتے ہوئے) سبحان اللہ کیا برجستہ اشعار ہیں۔

م ن ارشد : اب مرزا غزل کا دوسرا شعر فرمایئے

غالبؔ : میں اب مقطع ہی عرض کروں گا، کہا ہے:
عشق نے غالبؔ نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

عبدالحی نگاہ : گستاخی معاف مرزا۔ اگر اس شعر کا پہلا مصرع اس طرح لکھا جاتا تو ایک بات پیدا ہو جاتی۔

غالبؔ : کس طرح؟

© NCERT not to be republished

عبدالحی نگاہ : عشق نے، ہاں ہاں تمھارے عشق نے
عشق نے سمجھے؟ تمھارے عشق نے
مجھ کو نکمّا کر دیا
اب نہ اٹھ سکتا ہوں میں
اور چل تو سکتا ہی نہیں
جانے کیا بکتا ہوں میں
یعنی نکّما کر دیا
اتنا تمھارے عشق نے!
گرتا ہوں اور اٹھتا ہوں میں
اٹھتا ہوں اور گرتا ہوں میں
یعنی تمھارے عشق نے
اتنا نکمّا کر دیا

غالبؔ : (طنزاً) بہت خوب بھئی غضب کر دیا۔

غیظ احمد : اور دوسرا مصرع اس طرح لکھا جا سکتا ہے:
جب تک نہ مجھ کو عشق تھا
تب تک مجھے کچھ ہوش تھا
سب کام کر سکتا تھا میں
اور دل میں میرے جوش تھا
اس وقت تھا میں آدمی
اور آدمی تھا کام کا
لیکن تمھارے عشق نے
مجھ کو نکمّا کر دیا

© NCERT
not to be republished

غالبؔ : واللہ کمال ہی تو کر دیا۔ بھئی اب آپ لوگ اپنا کلام سنائیں۔

م ن ارشد : اب ڈاکٹر قربان حسین خالص جو جدید شاعری کے امام ہیں، اپنا کلام سنائیں گے۔

ڈاکٹر خالص : اجی ارشد صاحب میں کیا کہوں اگر میں امام ہوں تو آپ مجتہد ہیں۔ آپ جدید شاعری کی منزل ہیں اور میں سنگِ میل، اس لیے آپ اپنا کلام پہلے پڑھیے۔

م ن ارشد : توبہ توبہ اتنی کسرِ نفسی، اچھا اگر آپ مصر ہیں تو میں ہی اپنی نظم پہلے پڑھتا ہوں، نظم کا عنوان ہے ''بدلہ'' عرض کیا ہے:

آمری جان مرے پاس انگیٹھی کے قریب
جس کے آغوش میں یوں ناچ رہے ہیں شعلے
جس طرح دور کسی دشت کی پہنائی میں
رقص کرتا ہو کوئی بھوت کہ جس کی آنکھیں
کرمِ شب تاب کی مانند چمک اُٹھتی ہیں
ایسی تشبیہ کی لذّت سے مگر دور ہے تو
تو کہ اک اجنبی انجان سی عورت ہے جسے
رقص کرنے کے سوا اور نہیں کچھ آتا
اپنے بے کار خدا کے مانند
دوپہر کو جو کبھی بیٹھے ہوئے دفتر میں
خودکشی کا مجھے یک لخت خیال آتا ہے
میں پکار اٹھتا ہوں یہ جینا بھی ہے کیا جینا
اور چپ چاپ دریچے میں سے پھر جھانکتا ہوں
آمری جان مرے پاس انگیٹھی کے قریب
تاکہ میں چوم ہی لوں عارضِ گلفام ترا
اور اربابِ وطن کو یہ اشارہ کردوں

اس طرح لیتا ہے اغیار سے بدلہ شاعر
اور شب عیش گزر جانے پر
بہرِ جمّع درم و دام نکل جاتا ہے
ایک بوڑھے سے تھکے ماندے سے رہوار کے پاس
چھوڑ کر بستر سنجاب و سمور

(نظم سن کر سامعین پر وجد کی حالت طاری ہوجاتی ہے۔ ہیرا جی یہ کہتے ہوئے سنائی دیتے ہیں۔ یہ نظم اس صدی کی بہترین نظم ہے بلکہ میں کہوں گا کہ اگر ایک طرح سے دیکھا جائے تو اس میں انگیٹھی بھوت اور دفتر تہذیب وتمدن کی مخصوص الجھنوں کے حامل ہیں — حاضرین ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے زیرِلب مسکراتے ہیں۔)

غالبؔ : ارشد صاحب معاف کیجیے گا آپ کی یہ نظم کم از کم میرے فہم سے تو بالاتر ہے۔

غیظ احمد غیظ : یہ صرف ارشد ہی پر کیا منحصر ہے، مشرق کی جدید شاعری ایک بڑی حد تک مبہم اور ادراک سے بالاتر ہے۔

م ن ارشد : مثلاً میرے ایک دوست کے اس شعر کو لیجیے:
پاپوش کی کیا فکر ہے دستار سنبھالو
پایاب ہے جو موج گزر جائے گی سر سے

غالبؔ : (شعر کو دہرا کر) صاحب سچ تو یہ ہے کہ اگرچہ اس شعر میں سر اور پیر کے الفاظ شامل ہیں مگر باوجود ان کے اس شعر کا نہ سر ہے نہ پیر۔

م ن ارشد : اجی چھوڑیئے اس حرف گیری کو آپ اس شعر کو سمجھے ہی نہیں مگر خیر اس بحث میں کیا رکھا ہے۔ کیوں نہ اب ڈاکٹر قربان حسین خالص سے درخواست کی جائے کہ اپنا کلام پڑھیں۔

ڈاکٹر خالص : میری نظم کا عنوان ہے ''عشق''، عرض کیا ہے:
عشق کیا ہے؟
میں نے اک عاشق سے پوچھا
اس نے یوں رو کر کہا

© NCERT not to be republished

عشق اک طوفان ہے
عشق اک سیلاب ہے
عشق ہے اک زلزلہ
شعلۂ جوّالہ— عشق
عشق ہے پیغامِ موت

غالبؔ : بھئی یہ کیا مذاق ہے، نظم پڑھیے مشاعرے میں نثر کا کیا کام؟

ڈاکٹر خالص : (جھنجھلاکر) تو آپ کے خیال میں یہ نثر ہے! یہ ہے آپ کی سخن فہمی کا عالم؟ اور فرمایا تھا آپ نے :

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں

غالبؔ : میری سمجھ میں تو نہیں آیا کہ کس قسم کی نظم ہے نہ ترنم نہ قافیہ نہ ردیف۔

ڈاکٹر خالص : مرزا صاحب۔ یہی تو جدید شاعری کی خصوصیت ہے۔ آپ نے اردو شاعری کو قافیہ اور ردیف کی فولادی زنجیروں میں قید کر رکھا تھا۔ ہم نے اس کے خلاف جہاد کرکے اسے آزاد کیا اور اس طرح اس میں وہ اوصاف پیدا کیے ہیں جو محض خارجی خصوصیات سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔ میری مراد رفعتِ تخیل، تازگیِ افکار اور ندرتِ فکر سے ہے۔

غالبؔ : رفعتِ تخیل کیا خوب، کیا پرواز ہے؟

میں نے ایک عاشق سے پوچھا اس نے یوں رو کر کہا

ڈاکٹر خالص : (چڑ کر) عاشق رو کر نہیں کہے گا تو کیا قہقہہ لگا کر کہے گا؟ مرزا آپ یہ بھی نہیں جانتے کہ عشق اور رونے میں کتنا گہرا تعلق ہے۔

غالبؔ : مگر آپ کو قافیہ اور ردیف ترک کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔

رفیق احمد خوگر : اس کی وجہ مغربی شعرا کا تتبع نہیں بلکہ ہماری طبیعت کا فطری میلان ہے جو زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح شعروادب میں بھی آزادی کا جُویا ہے، اس کے علاوہ دورِ جدید کی روحِ انقلاب، کشمکش، تحقیق، تجسّس، تعقّل پرستی اور جدوجہد ہے۔ ماحول کی اس تبدیلی کا اثر ادب پر ہوا ہے اور میرے اس نکتے کو تھیکرے نے بھی اپنی کتاب ''وینٹی فیئر'' میں تسلیم کیا ہے۔ اس لیے ہم نے محسوس کیا کہ قدیم شاعری ناقص ہونے کے علاوہ

روح میں وہ لطیف کیفیت پیدا نہیں کرسکتی جو مثال کے طور پر ڈاکٹر خالص کی شاعری کا جوہر ہے۔قدیم شعرا اور جدید شعرا کے ماحول میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔قدیم شعرا بقول مولانا آزاد حسن و عشق کی حدود سے باہر نہ نکل سکے۔اور ہم جن میدانوں میں گھوڑے دوڑا رہے ہیں نہ ان کی وسعت کی کوئی انتہا ہے اور نہ ان کے عجائب ولطائف کا شمار۔

غالبؔ : میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

م ن ارشد : خوگر صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم ایک نئی دنیا میں رہتے ہیں۔ یہ ریڈیو ہوائی جہاز اور دھماکے سے پھٹنے والے بموں کی دنیا ہے۔ یہ بھوک بیکاری انقلاب اور آزادی کی دنیا ہے۔اس دنیا میں رہ کر ہم اپنا وقت حسن وعشق، گل وبلبل، شیریں وفرہاد کے افسانوں میں ضائع نہیں کر سکتے۔شاعری کے لیے اور بھی موضوعِ سخن ہیں جیسا کہ ہمارے ایک شاعر نے کہا ہے:

آج تک سرخ وسیہ صدیوں کے سائے کے تلے
آدم وحوا کی اولاد پہ کیا گزری ہے
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گزرے گی، اجداد پہ کیا گزری ہے
یہ حسیں کھیت پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
یہ ہر اک سمت پُراسرار کڑی دیواریں
یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے

راجہ مہر علی خاں : بہت خوب۔ یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے، ایسے ہی مضامین میں سے ایک مضمون ''ڈاک خانہ'' ہے جو میری اس نظم کا، جو میں ابھی آپ کے سامنے پڑھوں گا موضوع ہے۔

غالبؔ : ڈاک خانہ؟

راجہ مہر علی خاں : مرزا اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے۔سنیے عرض کیا ہے:

ڈاک خانے کے ہے اندر آج اف کتنا ہجوم
ڈالنے کو خط کھڑے ہیں کس قدر اف آدمی

ان میں ہر اک کی تمنا ہے کہ وہ
ڈال کر جلدی سے خط یا پارسل
بھاگ کر دیکھے کہ اس کی سائیکل
ہے پڑی باہر جہاں رکھ کر اسے
ڈاک خانہ میں ابھی آیا تھا وہ خط ڈالنے
جا رہے ہیں خط چہار اطراف کو
بمبئی کو، مصر کو، لندن کو، کوہِ قاف کو
دیکھنا آئی ہے اک عورت لفافہ ڈالنے
کون کہتا ہے کہ اک عورت ہے یہ
یہ تو لڑکا ہے کسی کالج کا کہ
جس کے بال
خدوخال
اس قدر ملتے ہیں عورت سے کہ ہم
اس کو عورت کا سمجھتے ہیں بدل
اف ہماری لغزشیں
ہے مگر کس شخص کا یہ سب قصور
کیا نظر میری نہیں کرتی ہے کام
جھٹپٹا سا ہو گیا ہے شام کا
یا ہمارے ہے تمدن کا قصور
کہ ہمارے نوجواں
ڈاک خانے میں ہیں جب آتے لفافہ ڈالنے
اس قدر دیتے ہیں وہ دھوکا ہمیں

کہ نظر آتے ہیں ہم کو عورتیں

(زوروں کی داد دی جاتی ہے۔ ہر طرف سے مرحبا بھئی کمال کر دیا، کے نعرے بلند ہوتے ہیں۔ مرزا غالبؔ کی سراسیمگی ہر لمحہ بڑھتی جارہی ہے)

م ن ارشد : اب میں ہندوستان کے مشہور شاعر پروفیسر غیظ سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنے تازہ افکار سے ہمیں نوازیں۔

پروفیسر غیظ : میں نے تو کوئی نئی چیز نہیں لکھی۔

ہیرا جی : تو پھر وہی نظم سنا دیجیے جو پچھلے دنوں ریڈیو والوں نے آپ سے لکھوائی تھی۔

پروفیسر غیظ : آپ کی مرضی ہے تو وہی سن لیجیے عنوان ہے ''لُگائی''

فون پھر آیا دل زار نہیں، فون نہیں
سائیکل ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات اترنے لگا کھمبوں کا بخار
کمپنی باغ میں لنگڑانے لگے سرد چراغ
تھک گیا رات کو چلّا کے ہر اک چوکیدار
گل کرو دامن افسردہ کے بوسیدہ داغ
یاد آتا ہے مجھے سرمۂ دنبالہ دار
اپنے بے خواب گھروندے ہی کو واپس لوٹو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

(نظم کے دوران میں اکثر مصرعے دو دو بلکہ چار چار بار پڑھوائے جاتے ہیں اور پروفیسر غیظ بار بار مرزا غالب کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ مرزا غالب مبہوت ہیں)

م ن ارشد : حضرات میرے خیال میں یہ کوئی عشقیہ نظم نہیں ہے بلکہ اس میں شاعر نے اینٹی فاشسٹ جذبے کو خوب نبھایا ہے۔

رقیق احمد : (سرگوشی کے انداز میں ہیرا جی سے) بکواس ہے!

م ن ارشد : اب جناب بکرماجیت ورما سے استدعا کی جاتی ہے کہ اپنا کلام سنائیں

بکرماجیت ورما : میں نے حسبِ معمول کچھ گیت لکھے ہیں۔

غالبؔ : (حیران ہوکر) شاعر اب گیت لکھ رہے ہیں مرے اللہ دنیا کدھر کو جا رہی ہے۔

بکرماجیت ورما : مرزا آپ کے زمانے میں گیت شاعری کی ایک باقاعدہ صنف قرار نہیں دیے گئے تھے۔ دورِجدید کے شعرا نے انھیں ایک قابلِ عزت صنف کا درجہ دے دیا ہے۔

غالبؔ : جی ہاں ہمارے زمانے میں عورتیں، بھانڈ، میراثی یا اسی قماش کے اور لوگ، گیت لکھا کرتے تھے۔

بکرماجیت ورما : پہلا گیت ''برہن کا سندیس'' عرض کیا ہے:

اڑ جا دیس بدیس رے کوّے اڑ جا دیس بدیس
سن کر تیری کائیں کائیں۔

غالبؔ : خوب، سن کر تیری کائیں کائیں!

بکرماجیت : عرض کیا ہے:

سن کر تیری کائیں کائیں
آنکھوں میں آنسو بھر آئیں
بول یہ تیرے من کو بھائیں
مت جانا پردیس رے کوّے اڑ جا دیس بدیس

م ن ارشد : بھئی کیا اچھوتا خیال ہے پنڈت صاحب میرے خیال میں ایک گیت آپ نے کبوتر پر بھی لکھا تھا وہ بھی مرزا کو سنا دیجیے۔

بکرماجیت ورما : سنیے پہلا بند ہے:

بول کبوتر بول
دیکھو کوئلیا کوک رہی ہے
من میرے ہوک اٹھی ہے
کیا تجھکو بھی بھوک لگی ہے
بول غٹرغوں بول کبوتر
بول کبوتر بول

باقی شعرا : (ایک زبان ہوکر) بول کبوتر بول، بول کبوتر بول

(اس اثنا میں مرزا غالبؔ نہایت گھبراہٹ اور سراسیمگی کی حالت میں دروازے کی طرف دیکھتے ہیں)

بکرما جیت ورما : اب دوسرا بند سنیے:

بول کبوتر بول
کیا میرا ساجن کہتا ہے
کیوں مجھ سے روٹھا رہتا ہے
کیوں میرے طعنے سہتا ہے
بھید یہ سارے کھول کبوتر
بول کبوتر بول

باقی شعرا : (ایک زبان ہوکر) بول کبوتر بول، کبوتر بول، کبوتر بول

(اس شوروغل کی تاب نہ لاتے ہوئے میاں رقیق احمد خوگر اور عبدالحی نگاہ کے سنانے کی باری آنے سے پہلے ہی مرزا غالبؔ، بھاگ کر کمرے سے باہر نکل جاتے ہیں)

(کنھیّا لال کپور)

مشق

لفظ و معنی

جلیل القدر	:	بڑی شان والا، نہایت معزّز
بعینہٖ	:	ہو بہ ہو
مدعو کرنا	:	دعوت دینا

شرف نیاز	:	کسی محترم یا بزرگ شخص کو دیکھنے یا اس سے ملنے کا اعزاز، کسی بزرگ کی خدمت میں حاضری دینا
من آنم کہ من دانم	:	''میں کیا ہوں یہ میں جانتا ہوں''، تعریف کے جواب میں اپنی عاجزی ظاہر کرنے کے لیے کہتے ہیں
فراغت	:	فرصت، چھٹکارا
خندہ زنی	:	ہنسی اُڑانا
موزوں	:	مناسب
برجستہ	:	رواں، چست درست، ڈھلا ہوا
کسرنفسی	:	اپنے آپ کو کم تر ظاہر کرنا، عاجزی
مجتہد	:	اجتہاد کرنے والا، نئی بات پیدا کرنے والا، نئی راہ نکالنے والا
کرمِ شب تاب	:	رات کو چمکنے والا کیڑا، جگنو
یک لخت	:	اچانک، یک بہ یک
عارض	:	گال، رُخسار
اغیار	:	غیر کی جمع، پرائے
درم و دام	:	روپیہ پیسہ
سنجاب	:	جنگلی جانور جس کی کھال ملائم بالوں والی ہوتی ہے، اس سے لباس تیار کیا جاتا ہے
سمور	:	شمالی برفستان کا جانور جس کی کھال بہت نفیس ہوتی ہے جس سے پوشاک بنائی جاتی ہے
وجد	:	سرمستی
مبہم	:	جس کا مطلب صاف نہ ہو، غیر واضح
ادراک	:	عقل، فہم
پاپوش	:	جوتا
سخن فہم	:	شعر کی خوبیوں اور خامیوں کو سمجھنے والا

© NCERT not to be republished

رفعتِ تخیّل	:	خیالات کی بلندی، اُڑان
ندرتِ فکر	:	سوچ کا انوکھا پن
تتبّع	:	تقلید، پیروی
میلان	:	جھکاؤ
جوُیا	:	تلاش کرنے والا
تعقّل پرستی	:	عقلیت پرستی، صرف اسی بات کو تسلیم کرنا جسے عقل قبول کرتی ہو
صف آرائی	:	ایک قطار میں کھڑا ہونا، کسی کے خلاف مقابلے کی تیاری
کوہِ قاف	:	ایک پہاڑ جو ایشیائے کوچک کے شمال میں واقع ہے۔ مراد وہ جگہ جہاں آدمی کا گزر نہ ہوسکے۔ کوہِ قاف کی پریاں مشہور ہیں
خدوخال	:	شکل وصورت
لغزش	:	پھسل جانا، غلطی
سراسیمگی	:	خوف، گھبراہٹ
دنبالہ	:	سرمے یا کاجل کی لکیر
مبہوت	:	حیرت زدہ، حیران پریشان
اینٹی فاشسٹ	:	مذہبی تنگ نظری اور ظلم وجبر کی طاقتوں کے خلاف آواز اٹھانے والا
چھب	:	نازوانداز، خوب صورتی
استدعا	:	درخواست، گزارش
میراثی	:	گانے بجانے والی ایک خاص قوم
اثنا	:	درمیان، بیچ

© NCERT not to be republished

غور کرنے کی بات

- کنھیّا لال کپور کی یہ تحریر ایک خیالی مشاعرے کا منظر پیش کر رہی ہے، جس میں غالب بھی موجود ہیں، اور جدید دور کے کئی نمائندہ شعرا اپنا کلام سنا رہے ہیں۔ کنھیّا لال کپور نے ان شعرا کی مشہور نظموں کی اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں نقل اتاری ہے۔ اسے انگریزی میں 'پیروڈی' کہتے ہیں۔ مصنف نے شعرا کو جو نام دیے ہیں وہ ہمارے جدید شعرا کے ناموں سے ملتے جلتے ہیں، جیسے ن۔م۔راشد، میراجی، تصدق حسین خالدؔ، اندر جیت ورما، راجہ مہدی علی خاں، فیض احمد فیضؔ وغیرہ۔
- مصنف نے اس مضمون میں ایسی جدت پسندی کا مذاق اڑایا ہے جو توازن سے عاری ہو۔

سوالات

1. غالبؔ نے پہلا شعر کون سا سنایا اور کیا کہہ کر اس کا مذاق اڑایا گیا؟
2. م۔ن۔ارشد کی نظم پر ہیرا جی نے کیا تبصرہ کیا؟
3. ڈاکٹر خالص نے جدید شاعری کی کیا خصوصیات بتائی ہیں؟
4. بکرما جیت ورما نے جو کلام سنایا اس کا تعلق کس صنف سے ہے؟

عملی کام

- اپنے اسکول میں تمثیلی مشاعرے کا اہتمام کیجیے۔
- اس مضمون میں شامل پانچ شعرا کے اصل نام لکھیے۔

© NCERT not to be republished

سفرنامہ

سفرنامہ ہمارے زمانے کی ایک مقبول صنف ہے۔ ہر سفر ایک تجربہ ہوتا ہے اور اگر کسی شخص میں اس تجربے کو بیان کرنے کی صلاحیت بھی ہو تو ایک دل چسپ سفرنامہ لکھا جاسکتا ہے۔ پرانے زمانے میں جب مسافر سفر سے واپس آتے تو اپنے تجربات کی روداد دوستوں اور عزیزوں کو سناتے تھے۔ اس طرح کے بہت سے قصّے آپ نے بھی پڑھے ہوں گے۔ اردو نثر کی ترقی کے ساتھ ہمارے ادبی سرمائے میں کئی صنفوں کا اضافہ ہوا۔ سوانح نگاری، خودنوشت، تنقید، انشائیہ اور سفرنامہ، نثر کی نسبتاً جدید تر صنفیں کہی جاتی ہیں۔

سفرنامے کے مطالعے سے ہمیں اجنبی دیاروں، دور دراز کے ملکوں، تہذیبوں اور جغرافیائی حالات سے آگاہی ملتی ہے۔ بہت سے انوکھے کرداروں سے ملاقات ہوجاتی ہے۔ سفرنامے ہمارے لیے اس دنیا کے مختلف علاقوں سے تعارف کا ذریعہ بنتے ہیں۔ سفرناموں کے مطالعے سے ہماری عام معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہم گھر بیٹھے بڑی بڑی مہمیں سر کرلیتے ہیں اور ایسے دیاروں تک جا پہنچتے ہیں جہاں جانا ہمارے لیے آسان نہ ہوتا۔ اس لحاظ سے سفرنامے کو عملاً سفر کا بدل بھی کہا جاسکتا ہے۔

اردو کا پہلا سفرنامہ یوسف خاں کمبل پوش کا ''عجائباتِ فرنگ'' ہے۔ یوسف خاں نے 30 مارچ 1837 میں کلکتہ سے پانی کے جہاز کے ذریعے انگلستان کا سفر کیا تھا۔ انھوں نے انگلستان کے شہر لندن میں قیام کیا۔ وہاں کی آب و ہوا، نئی نئی ایجادات اور وہاں کے باشندوں کا ذکر انھوں نے نہایت دل چسپ انداز میں کیا ہے۔

سر سید احمد خاں کے سفرنامے ''مسافرانِ لندن'' کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔

سر سید کے معروف معاصرین میں محمد حسین آزاد کا سفرنامہ ''سیرِ ایران'' اور مولانا شبلی نعمانی کے ''سفرنامۂ روم و مصر و شام'' بھی اہم سفرنامے ہیں۔

بیسویں صدی کے سفرناموں میں منشی محبوب عالم کے دو سفرنامے ''سفرنامہ یوروپ'' اور ''سفرنامۂ بغداد''، قاضی عبدالغفار کا سفرنامہ ''نقشِ فرنگ'' بہت مقبول ہوئے۔

خواجہ احمد عباس کا ''مسافر کی ڈائری'' پروفیسر احتشام حسین کا ''ساحل اور سمندر'' قرۃ العین حیدر کا ''جہانِ دیگر'' اور ''شاہراہِ حریر'' اردو کے دل چسپ سفرنامے ہیں۔ مشہور سفرنامہ نگاروں میں بیگم اختر ریاض، مستنصر حسین تارڑ کے نام بھی شامل ہیں۔ اردو میں چند مزاحیہ سفرنامے بھی لکھے گئے ہیں جن میں ابن انشا، شفیق الرحمٰن اور مجتبیٰ حسین کے سفرنامے قابلِ ذکر ہیں۔

© NCERT not to be republished

رام لعل

1923 تا 1996

رام لعل اردو کے مقبول افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوں کے تقریباً بارہ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے تین ناول بھی لکھے ہیں۔ وہ مغربی پنجاب کے شہر میانوالی میں پیدا ہوئے۔ لاہور میں تعلیم حاصل کی اور وہیں ریلوے میں ملازم ہو گئے۔ تقسیم کے بعد رام لعل ہندوستان آ گئے اور یہاں بھی ریلوے میں ملازمت کر لی۔

رام لعل نے دو سفرنامے ''خواب خواب سفر'' اور ''زرد پتّوں کی بہار'' بھی لکھے۔ پہلا یورپ کے سفر کی روداد ہے اور دوسرے میں پاکستان کے سفر کی تفصیلات ہیں۔

رام لعل کا دوسرا سفرنامہ اس اعتبار سے بہت انوکھا ہے کہ یہ سفر مصنّف نے نئی دنیا کی دریافت کے لیے نہیں کیا بلکہ اپنی پرانی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے کیا تھا۔ اس لیے اس سفرنامے میں ماضی اور حال ایک دوسرے سے گلے ملتے نظر آتے ہیں۔ وہ جب کسی جگہ کسی عمارت کو دیکھتے ہیں یا کسی شخص سے ملتے ہیں تو اس کے حوالے سے انھیں اپنے لاہور کے دنوں کی یاد آنے لگتی ہے۔

رام لعل کو سفرنامہ نگار کی حیثیت سے اپنے مشاہدات اور تجربات کو مناسب الفاظ میں پیش کرنے کا فن آتا ہے۔ اس سفرنامے میں ان کی نثر بہت سادہ اور رواں ہے۔

© NCERT not to be republished

5257CH15

زرد پتّوں کی بہار

میں جب واہگہ کے راستے آٹھ فروری 1980 کو ریل کے ذریعے لاہور کی طرف بڑھ رہا تھا تو میرے دل میں کئی طرح کے وسوسے تھے۔ میں وہاں کیوں جا رہا ہوں؟ وہاں تو اب میرا کوئی سگا سمبندھی بھی نہیں رہتا۔ پاکستان سرکار نے 1978 میں ایک بار میری ویزا کی درخواست مسترد کر دی تھی۔ اب دوسری بار درخواست دینے پر اچانک منیر احمد شیخ نے جو ہندوستان میں پاکستانی سفارت خانے میں پریس کونسلر ہیں، مجھے یہ کہہ کر ویزا دلوا دیا کہ موجودہ حکومتِ پاکستان دونوں طرف کے عوام میں محبت اور دوستی کے جذبات کو بڑھانا چاہتی ہے۔ اب میں اپنے قلم کے رشتے داروں سے ہی ملنے کے لیے وہاں جا رہا ہوں، جن میں سے بیشتر کی کتابیں مجھے ملتی رہی ہیں۔ جن کے رسالوں میں میں چھپتا رہا ہوں اور جن کے خدوخال، میں ان کی تخلیقات سے پہچانتا ہوں۔ ان میں سے کئی ایک نے اکثر مجھے اپنے یہاں آنے کی دعوت دی ہے۔

میں میانوالی میں پیدا ہوا تھا، جہاں میرے آباواجداد صدیوں پہلے راجستھان کے ریتیلے میدانوں میں گھوڑوں پر عرب حملہ آوروں کے آگے آگے بھاگتے ہوئے وہیں جا کر پناہ گزیں ہوئے تھے۔ اس سے بھی بہت پہلے وہ کشمیر اور وزیرستان کے کسی

© NCERT not to be republished

درمیانی علاقے کی سلطنت اجڑ جانے پر جنوب کی طرف ایک قافلے کے ساتھ راجستھان کی طرف نکل گئے تھے۔نقل مکانی مجھے وراثت میں ہی ملی ہے۔ اب میں عارضی طور پر اس جگہ کی طرف لوٹ رہا ہوں جہاں میرے کئی بزرگوں اور عزیزوں نے آخری سانسیں لی تھیں۔جس مکان میں میری ماں نے جان دی تھی اور جس کی شکل بھی مجھے یاد نہیں ہے۔ کیونکہ تب میں صرف دو اڑھائی سال کا تھا۔ اسی مکان میں اسے پھر سے تلاش کروں گا۔ میں بھی اسی مکان میں پیدا ہوا تھا۔ لاہور میں جوان ہوا تھا۔ اور وہاں سے میں جوان ہی ہو کر آیا تھا۔ اب چھپن برس کی عمر میں وہاں لوٹ رہا ہوں۔ میرے بچپن اور بڑھاپے کے درمیان عمر کا یہ فاصلہ کس قدر طویل ہو گیا تھا، جو اَب ریل کی رفتار کے ساتھ لمحہ بہ لمحہ سمٹتا جا رہا ہے، کم ہوتا جاتا ہے، اسی فاصلے کو میں بے شمار بار خوابوں کی مدد سے آناً فاناً لانگھ گیا۔خوابوں کے سامنے سرحدیں اور فاصلے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ میں اپنے ماضی کے ساتھ اس لیے ابھی تک جڑا رہا ہوں کہ وہ میرے خوابوں میں اپنی اصلی حالت میں ابھی تک موجود رہا ہے۔ میں نے اتنا عرصہ خوابوں کے ساتھ جینا سیکھا ہے۔ میں نے اپنے ماضی کو بھلانے کی کبھی کوشش کی تو یہ اچانک میری کسی نہ کسی کہانی میں گھس کر بیٹھ گیا۔ ماضی انسان کی پہچان بن جاتا ہے۔ یہ نہ ہو تو وہ بالکل اجنبی بن جائے۔کسی دوسری ہی دنیا کا انسان جس کے پاؤں زمین کے ساتھ نہیں لگے ہوں گے۔ماضی ہماری زمین ہے اور زمین ہی کے ساتھ ہم نے ہمیشہ گہرا رشتہ قائم رکھا ہے۔

میں اچانک ماضی کی بھول بھلیّوں میں سے نکل کر لاہور کے مضافات میں پھیلے ہوئے کھیتوں، اینٹوں کے بھٹّوں، چھوٹے چھوٹے قصباتی مکانوں اور چھوٹی چھوٹی مسجدوں کے مناروں کے درمیان پہنچ جاتا ہوں۔ میں محسوس کرنے لگتا ہوں میرے نتھنوں میں جو تازہ ہوا آ رہی ہے وہ میری جانی پہچانی سی ہے۔ میں اس کی خوش بو سونگھ کر بتا سکتا ہوں کہ یہ میرے لاہور سے آ رہی ہے۔ پنجاب کے اس حصے سے آ رہی ہے جسے میں کبھی بھلا نہیں پایا۔ میں ریلوے ٹرین کی کھڑکی میں سے بڑی خاموشی سے تیزی سے گزرتے ہوئے واچ ٹاوروں اور اونچی اونچی اُگی ہوئی گھاس پھوس اور مٹی میں چھپے ہوئے پل باکسوں کی طرف دیکھتا ہوں جہاں سے سن پینسٹھ میں بڑی کامیابی سے ہندوستانی یلغار سے دفاع کیا گیا تھا۔ اب تو یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔صرف ہوا ہے اور دھوپ ہے اور خوشبو ہے اور کھیتوں میں ہر طرف اُگے ہوئے سنہری گندم کے لہلہاتے ہوئے خوشے ہیں اور ریل کی پٹری کے متوازی دوڑتی ہوئی ایک سڑک ہے جس پر دو جاپانی کاریں آگے پیچھے دوڑ رہی ہیں اور ایک ٹوبھے (جوہڑ) کے سامنے کئی بھینسیں بیٹھی ہوئی ہیں جن کی طرف ذرا فاصلے پر ایک چھکڑے کے پہیّے کے ساتھ بندھا ہوا ایک اونٹ فلاسفروں کی سی گمبھیرتا سے ایک ٹک دیکھ رہا ہے اور ایک پیڑ کے نیچے ایک گبرو لیٹے لیٹے بانسری بجا رہا ہے اور ایک مکان کے آنگن کی دیوار پر کوئی دوشیزہ دھوپ میں سوکھتے ہوئے رنگین کھیس کو الٹ پلٹ کر دیکھتے دیکھتے اچانک گاڑی کی طرف متوجہ ہو گئی ہے۔

پھر میری نظروں کے سامنے مغل پورہ ورکشاپ کے شیڈوں کے چمکتے ہوئے ٹین ابھر آتے ہیں۔ یہیں کہیں میں پانچ سال تک بطور اپرنٹس خراد مشین کا کام سیکھتا رہا تھا۔ ریل کا شور اچانک بڑھ گیا ہے۔ اب گاڑی یارڈ میں داخل ہوگئی ہے۔ دونوں طرف مال گاڑیوں کا سلسلہ ہے جس میں سے نکلتے ہی اچانک مجھے لاہور کا سائن بورڈ دکھائی دے جاتا ہے، اور گاڑی پلیٹ فارم پر پہنچ کر رک جاتی ہے اس ڈبے میں میرا ہم سفر علی عباس حسینی مرحوم کا ایک رشتے دار ہے جسے کراچی جانا ہے۔ وہ اور میں دونوں کتنی دیر سے خاموش ہیں۔ وہ مجھے بڑی خاموشی سے بیٹھا ہوا دیکھتا ہے تو کہہ اٹھتا ہے۔

''رام لعل صاحب، قلی کو بلایا جائے؟''

میں اسے کوئی جواب دیے بغیر پلیٹ فارم پر اتر جاتا ہوں۔ پلیٹ فارم پر چل کر محسوس کر رہا ہوں، میں واقعی زمین پر ہوں۔ یہ خواب نہیں ہے۔ جو خواب تھا وہ اب پورا ہو چکا ہے۔ قلی سامان اٹھا کر آگے آگے بھاگ رہے ہیں۔ گاڑی کے ہر ڈبے سے سیکڑوں لوگ اُبل سے پڑے ہیں۔ بمبئی، حیدرآباد، مدھیہ پردیش اور بہار اور یوپی کے لوگ مرد اور عورتیں اور بچے۔ سفر کی گرد سے اٹے ہوئے اور پریشان اور حواس باختہ کچھ عورتیں جلدی جلدی اپنے برقعے پہن رہی ہیں۔ ایک لڑکے کے ہاتھ میں کرکٹ کا بلا ہے۔ ایک لڑکی اپنے بیگ میں جلدی جلدی فلم فیر ٹھونس رہی ہے۔ اسے وہ کسٹم والوں کی نظر سے بچا کر اپنی ہندوستانی فلموں کی شوقین فرینڈز تک لے جانا چاہتی ہے۔ جہاں قلی نے لے جا کر میرا سامان ایک طرف رکھ دیا تھا وہاں پاسپورٹ چیک کرانے والوں کی بھیڑ دیکھ کر میں گھبرا جاتا ہوں۔ یہاں تو کئی گھنٹے اپنی باری آنے میں لگ جائیں گے۔ کسٹم کے پاکستانی عملے کی طرف میں بڑی خاموشی سے دیکھتا ہوں۔ یہ سب لوگ خوبصورت اور اسمارٹ ہیں سب پنجابی ہی بولتے ہیں۔ قلی بھی پنجابی بولتے ہیں۔ لال لال وردیوں کے نیچے نیشنل ڈریس بھی پہنے ہوئے ہیں۔ یک رنگی شلوار اور قمیص، شکل وصورت سے قلی نہیں لگتے۔ میں خود کو پنجابی بولنے کے لیے آمادہ کر کے ایک آدمی کو روک کر پوچھتا ہوں۔

''اِتھے ریسیو کرن آن والے لوگ تاں باہری کھڑے رہندے نیں؟''

بھیڑ میں اچانک میرے سامنے ڈاکٹر احراز نقوی کا چہرہ ابھر آتا ہے، وہ جلدی سے میرے ہاتھ سے پاسپورٹ اور ویزا لے کر کسٹم والوں کی طرف چل دیتا ہے۔ وہ بھی دوسرے مسافروں کی طرح گھبرایا ہوا ہے۔ اس کی گھبراہٹ پر میں مسکرا دیتا ہوں اور پھر میرے سامنے تین اور مسکراتے ہوئے چہرے آجاتے ہیں۔ ڈاکٹر آغا سہیل، طاہر تونسوی اور ابصار عبدالعلی، احراز کی طرح آغا سہیل اور ابصار بھی لکھنؤ کے ہیں۔ ان تینوں کو میں ان کے بچپن سے جانتا ہوں۔ وہ ہماری ادبی محفلوں میں ہی جوان ہوئے ہیں اور اب لاہور کی محفلوں میں جگمگا رہے ہیں۔ طاہر تونسوی پچھلے سال ڈاکٹر مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم پر ریسرچ کرنے کے لیے

لکھنؤ آیا تھا اور دو مہینے وہاں رہا تھا۔ان کے ساتھ بشیر بھی تھے۔ طاہر رضا زیدی کا ڈرائیور۔ وہ سب میرے سامان کا ایک ایک نگ اٹھا کر بھیڑ میں گھستے چلے جاتے ہیں۔ ایک پوسٹ سے دوسری پوسٹ پر۔وہ وہاں کسی نہ کسی کو ضرور جانتے ہیں۔ ان سے مجھے بھی متعارف کراتے جاتے ہیں۔ رام لعل کا افسانہ نگار ہونا جیسے کوئی اہم بات ہو! سب لوگ ہاتھ ملا کر مسکراتے ہیں اور مجھے آگے بڑھ جانے کے لیے کہتے ہیں۔ اچانک ایک ٹکٹ کلکٹر مجھ سے ٹکٹ طلب کرتا ہے۔ امرتسر سے لاہور تک کا اور میں اچانک یاد کر کے بتاتا ہوں ٹکٹ تو میں نے لیا ہی نہیں تھا۔ میں تو ریلوے کا ملازم ہوں۔ آپ ہی کی طرح''

وہ مسکرا کر مجھے جانے دیتے ہیں۔

''اب تم لاہور میں ہو! اپنے لاہور میں!'' آغا سہیل مسکرا رہا ہے۔

''میں نے یہاں سے آخری بار تنخواہ لی تھی۔ چھ اگست 1947 کو۔'' میں اسی پلیٹ فارم پر بنے ہوئے کیش آفس کی طرف اشارہ کر کے بتاتا ہوں۔

''اور میں اسی پلیٹ فارم سے کالکا میل سے جالندھر کے لیے روانہ ہوا تھا۔''

لاہور اسٹیشن کے باہر دو کاریں موجود تھیں۔ ایک تو ابصار عبدالعلی کی تھی۔ دوسری طاہر رضا زیدی نے بھجوائی تھی۔ وہیں پر کراچی سے آئے ہوئے راحت سعید اور 'واہ سیمنٹ فیکٹری' کے محمد حسن عسکری بھی موجود تھے۔ ان دونوں سے میرا پہلی بار تعارف ہوا۔ راحت سعید، پی آئی اے میں ٹیکنیکل منیجر ہیں اور اکثر مختلف ملکوں میں گھومتے رہتے ہیں۔ وہ میری خاطر رک گئے تھے اور اسی شام کو کراچی جانے کا پروگرام بنا چکے تھے۔ ایک شام پہلے اردو کے منفرد نقاد محمد علی صدیقی کو ایک بہت ضروری کام سے واپس کراچی جانا پڑ گیا تھا لیکن وہ معذرت کے ساتھ ساتھ یہ بھی پیغام چھوڑ گئے تھے کہ اب وہ میرا استقبال کراچی میں ہی کریں گے۔

اچانک آغا سہیل نے مجھ سے پوچھا۔

''لاہور کو کچھ بدلا ہوا پایا......؟''

میں نے سر گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں جو بلاشبہ ایک ذہین کہانی کار کی آنکھیں تھیں، مجھ پر ٹکی ہوئی تھیں اور میری حیرت سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ وہ بھی تو لکھنؤ کی گلیوں سے کٹ چکا تھا۔ چند ماہ پہلے آیا تھا تو وہ بھی تو وہاں اپنے کھوئے نشان تلاش کرتا پھرا تھا۔ کہاں بیٹھ کر وہ دوستوں کے ساتھ چائے پیا کرتا تھا۔ کس جگہ اس نے جمال پاشا کے ساتھ ایک خاص ایکٹی وٹی کی تھی اور یونیورسٹی جانے کے لیے وہ کون کون سی گلیوں سے ہو کر نکلتا تھا۔ تب وہ لکھنؤ آزادی سے پہلے کا تھا اور اپنی ساری روایات اور پورے آب و تاب کے ساتھ موجود تھا۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے جواب دیا:

’’بہت کچھ تو وہی ہے۔ بہت کچھ نیا نیا سا بھی ہے۔‘‘

آغا سہیل کی رہایش گاہ واقع ایف سی کالج میں دونوں گاڑیاں ساتھ ساتھ پہنچیں۔ اُن کے بیٹے محسن سے پہلی بار ملاقات ہوئی باپ سے کچھ زیادہ ہی اونچا اور صحت مند نظر آیا۔ اس نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ ہاتھ ملایا اور میرا سامان بشیر کی مدد سے اتروا کر اندر لے گیا۔ ہم سب ایک کھلے کھلے اور خوبصورتی سے سجے ہوئے ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے، ابصار عبدالعلی ، طاہر تونسوی، احراز نقوی، محمد حسن عسکری اور راحت سعید، آغا سہیل اندر چائے کا انتظام کرنے چلا گیا تھا۔ پھر اس کی آواز بھی سنائی دی وہ فون کر رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ آیئے آپ کو اپنے ایک دیرینہ رفیق سے ملاؤں......

اُس طرف احمد ندیم قاسمی تھے۔ جمعہ کی وجہ سے گھر پر تھے۔ ایک مدت کے بعد (1942 کے بعد) میں نے ان کی آواز سنی۔ اتنے قریب سے۔ اس شہر میں مجھے سب سے پرانے جاننے والوں میں ایک وہ تھے، دوسرے میرزا ادیب۔ میرزا ادیب صاحب سے بھی پہلی ملاقات دہلی میں 1961 میں پہلی ہندو پاک ثقافتی کانفرنس میں ہوئی تھی۔ قاسمی صاحب نے پوچھا:

’’کب آئے؟‘‘

میں نے بتایا ’’بس ابھی آ کر بیٹھا ہوں۔‘‘

’’خوش آمدید۔ سب خیریت ہے نا۔ کب ملو گے؟‘‘

’’جی شکریہ۔ جس وقت آغا سہیل لے کر آئیں گے، حاضر ہو جاؤں گا۔‘‘

’’اچھا کیا پروگرام ہے؟‘‘

’’میں آج ہی رات کو ملتان چلا جاؤں گا۔ وہاں کل میرے ایک دوست کی شادی کا ولیمہ ہے۔‘‘

کچھ باتیں اور بھی ہوئیں۔ پھر میں جلدی جلدی گرم پانی سے نہا کر اور کپڑے بدل کر ڈرائنگ روم میں آ بیٹھا سہیل صاحب کی بیگم اور ان کے بچوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ بہت سے پروگرام طے ہونے لگے لیکن کوئی پروگرام نہ بن سکا۔ آخر فیصلہ یہی ہوا کہ میں آج رات سے پہلے کہیں نہیں جاؤں گا۔ اور ملتان سے لوٹ کر ہی سب سے ملوں گا۔ سب لوگ چائے پی کر اور رخصت لے کر چلے گئے۔

(رام لعل)

مشق

لفظ و معنی

خدشہ	:	خطرہ، ڈر، خوف، اندیشہ
غمّاز	:	اشارہ کرنے والا، چغل خور
مضافات	:	مضاف کی جمع، اِردگرد، شہر کے آس پاس کے قصبے، گاؤں
یلغار	:	حملہ
دفاع	:	بچاؤ
عملہ	:	کسی محکمے کے ملازم، کام کرنے والے، کارکن

غور کرنے کی بات

- ملک کی تقسیم کے بعد ایک شخص جو اپنا وطن چھوڑ کر دوسری جگہ جا بستا ہے اسے دوبارہ اپنے وطن کی یاد کس طرح بے چین کرتی ہے اور اسے ایک بار پھر وہاں جانے کا موقع ملتا ہے تو اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ اس کا اظہار اس سفرنامے میں بخوبی کیا گیا ہے۔ وطن سے محبت کا جذبہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔

سوالات

1. ایک اچھے سفرنامے میں ہم کیا کیا خوبیاں تلاش کرتے ہیں؟
2. رام لعل پاکستان کیوں جانا چاہتے تھے؟
3. لاہور پہنچ کر رام لعل کن معروف ادیبوں سے ملے؟
4. اپنے ماضی کے بارے میں رام لعل نے جو باتیں لکھی ہیں انھیں اپنے لفظوں میں لکھیے۔

عملی کام

- آپ نے اگر کسی ملک یا شہر کا سفر کیا ہے تو اسے سفرنامے کی صورت میں تحریر کیجیے۔

© NCERT not to be republished

خاکہ

اصطلاحی معنی میں لفظ'' خاکہ'' انگریزی لفظ اسکیچ (Sketch) کا ترجمہ ہے۔شخصی خاکے کے لیے انگریزی میں Pen Portrait یا Personal Sketch کی اصطلاحیں بھی استعمال کی گئی ہیں۔آج کل'' خاکہ'' ہی کی اصطلاح رائج ہے۔خاکے سے مراد ایسی نثری تحریر ہوتی ہے جس میں کسی شخصیت کی منفرد اور نمایاں خصوصیات کو اس انداز سے بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی مکمّل تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے۔اس میں جس شخص کی تصویر کشی کی جاتی ہے اس کے خیالات و افکار، سیرت و کردار، عادات واطوار سب کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔خاکے کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ متعلقہ شخصیت کی ظاہری اور باطنی خصوصیات میں سے ایسے نمایاں اوصاف کا بیان کیا جائے، جو اس کی انفرادیت اور پہچان کا ذریعہ ہوں۔اس کے لیے خاکہ لکھنے والے کا اُس انسان کی شخصیت سے نہ صرف متاثّر ہونا ضروری ہے بلکہ اُس سے واقفیت اور قربت بھی ضروری ہے۔خاکہ نگاری سوانح نگاری سے مختلف ہے۔اس میں سوانح حیات کی طرح واقعات ترتیب وار نہیں لکھے جاتے اور نہ ہی تمام حالات و واقعات کا بیان کرنا ضروری ہے، بلکہ خاکہ نگاری میں حالات و واقعات کا بیان ضمنی طور پر کیا جاتا ہے جو شخصیت کے کسی پہلو کو اُجاگر کرتے ہیں۔خاکہ نگار کسی شخصیت سے متاثر ہوکر اس کا خاکہ ضرور لکھتا ہے، لیکن اس کی تحریر سے مرعوبیت کا اظہار نہیں ہونا چاہیے۔اُس کا بیان ایسا ہونا چاہیے کہ وہ غیر جانبدار نظر آئے۔اس لیے یہ ضروری ہے کہ خاکے میں شخصیت کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کو بیان کیا جائے، ورنہ شخصیت کی مکمّل تصویر سامنے نہ آسکے گی جو خاکہ نگاری کا اصل مقصد ہے۔جس طرح خوبیوں کا بیان مرعوبیت سے پاک ہونا چاہیے، اسی طرح خامیوں کے بیان میں ذاتی دشمنی وعناد کا پہلو نہیں آنا چاہیے۔خامیوں کے بیان میں بھی اپنائیت کا احساس نمایاں ہونا چاہیے۔

کتاب میں شامل خاکہ '' کلیم الدین احمد'' خاکہ نگاری کی اچھی مثال ہے۔

© NCERT not to be republished

احمد جمال پاشا

1929 تا 1987

احمد جمال پاشا کا اصلی نام محمد نزہت پاشا ہے۔ وہ الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد آغا شجاعت حسین پاشا نے بعد میں امین آباد، لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔اے۔ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم۔اے۔ کیا۔ لکھنؤ سے ''اودھ پنچ'' نکالنا شروع کیا جسے اِس کا تیسرا دور کہا جاتا ہے۔ بعد میں ''قومی آواز'' اخبار کے شعبۂ ادارت سے منسلک ہوگئے جس کے ایڈیٹر مشہور افسانہ نگار حیات اللہ انصاری تھے۔ 1976 میں سیوان (بہار) منتقل ہوگئے، جہاں ذکیہ آفاق اسلامیہ کالج میں اردو کے استاد کے طور پر خدمات انجام دیں۔ پٹنہ میں انتقال ہوا۔

احمد جمال پاشا نے 1950 سے لکھنا شروع کیا۔ زمانۂ طالب علمی میں علی گڑھ کے رسالے ''اسکالر'' کے مدیر ہوئے اور اُس کے ''پیروڈی نمبر'' کی وجہ سے شہرت پائی۔ ''اندیشۂ شہر''، ''ستم ایجاد''، ''لذّت آزار''، ''مضامین پاشا''، ''چشم حیراں'' اور ''پتّوں پر چھڑکاؤ'' وغیرہ ان کی مشہور مزاحیہ کتابیں ہیں۔ ''ظرافت اور تنقید'' ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان کے مشہور مضامین میں ''ادب میں مارشل لا''، ''مجھ سے ایک چائے کی پیالی نے کہا''، ''یونیورسٹی کے لڑکے''، ''گلّی ڈنڈے پر سیمینار'' اور ''رستم امتحان کے میدان میں'' اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے بعض پیروڈیاں بھی لکھیں جن میں ''کپور: ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ'' اور ''آموختہ بیانی میری'' کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ آخری زمانے میں انھوں نے خاکہ نگاری کی طرف توجہ کی۔

احمد جمال پاشا کو ادبی خدمات کے لیے غالبؔ ایوارڈ اور بہار اردو اکادمی کا اختر اورینوی ایوارڈ دیا گیا۔

© NCERT not to be republished

5257CH16

کلیم الدّین احمد

یہ بات کوئی 1954–55 کی ہے جب میں استاذی پروفیسر سید احتشام حسین کی خدمت میں حاضر ہوتا اور اگر وہ تنہا ہوتے تو ایک کتاب بہت غور سے پڑھتے یا اس پر پنسل سے نشان لگاتے ہوتے ۔ ہم لوگوں کو بڑی جستجو رہتی کہ آخر یہ کون سی کتاب ہے ۔اس کتاب پر ایک موٹا سا چمک دار کور چڑھا رہتا جو غالباً کسی کلینڈر کو کاٹ کر تیار کیا گیا تھا۔ کبھی کبھی وہ اتنے منہمک اور مستغرق ہوتے کہ ہماری موجودگی تک کا نوٹس نہ لیتے۔ اس کو پڑھتے میں ان کے چہرے کا رنگ بدلتا رہتا اور اکثر بڑبڑاتے بھی ۔ ہمارا محتاط اندازہ یہ تھا کہ یہ یا تو تنقید پر کوئی کتاب ہے یا پھر اس کی شرح یا کنجی ہے، مگر ہمارے ایک دوست شوکت عمر کا محتاط اندازہ تھا کہ اس کتاب کا تعلق بارودسازی کی صنعت سے ہے یا پھر اس میں بم بنانے کا نسخہ درج ہے۔ وہ کتاب رفتہ رفتہ سوت کی حیثیت اختیار کرتی جارہی تھی ۔ایک دن دوپہر کو ہم لوگ مئی جون کی گرمی میں پہنچے تو دیکھا کہ قبلہ تو بے خبر انٹاغفیل ہیں اور سرہانے میرؔ کے وہی سوت نما کتاب دھری ہے ۔ ہم لوگوں نے آپس میں آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارے کیے، خاموشی سے کتاب اٹھائی اور غائب ہوگئے۔

گولہ گنج میں مہدی کے ہوٹل میں ان تمام صاحب زادوں نے جو مستقبل میں اردو شعر وادب کے چاند ستارے قرار پانے والے تھے، اس کتاب کو بہت ہی غور سے کھولا ۔ کتاب کا کور نکال کر الگ کر دیا۔ اس پر لکھا تھا:

’’اردو تنقید پر ایک نظر‘‘

ازکلیم الدین احمد

ساری کتاب پر معلوم ہوتا تھا کہ پنسل سے چاند ماری کر کے گود دیا گیا تھا۔ کچھ اس قسم کے سوالات اٹھائے گئے تھے۔

’’آخر کلیم الدین کیا چاہتے ہیں؟‘‘

بات تو صحیح ہے مگر آخر یہ انداز کس حد تک مناسب ہے؟‘‘

’’کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔‘‘

’’مخالفت تو آسان ہے مگر مارکسزم سمجھنا بہت مشکل ہے۔‘‘

© NCERT not to be republished

''بات تو سیدھی ہے مگر اس میں برہمی یا طنز کی کیا گنجائش تھی؟''

''تکرار''

''ژولیدہ بیانی''

''آخر اس بات کا مغرب سے کیا تعلق؟''

''غزل سے انگریزی شاعری یا مغرب کا کیا واسطہ؟''

''یہ تعریف ہے یا ہجو ملیح؟''

''مطلب واضح نہ ہو سکا۔''

''آخر کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

محسوس یہ ہوتا تھا کہ استادِ محترم اس کتاب کو پڑھتے نہیں بلکہ اس کتاب پر مصنف سے ذہنی کشتی لڑتے تھے۔ جا بجا کتاب پر مارکس اور اینگلز کے اقوالِ زرّیں درج تھے۔

ہم لوگوں کا خیال تھا کہ کلیم الدین احمد کوئی بہت بے ڈھب آدمی ہے جو ہمارے استاد کو بری طرح پریشان کیے ہوئے ہے۔ مجبوری یہ تھی کہ معاملے کی تہہ یا گہرائی تک پہنچنے کی صلاحیت ہم میں سے کسی میں نہ تھی اور کتاب غائب کرنے کے بعد اب مصنف کے بارے میں استاد سے دریافت کرنا بارود کو آگ دکھانا تھی۔ اس لیے کلیم الدین روزِ اول ہی ہمارے لیے معمہ بن گئے۔ اب کیا کیا جائے۔ طے پایا کہ چونکہ ہم لوگوں نے سرور صاحب کو سرِ دست کوئی نقصان نہیں پہنچایا ہے، اس لیے ان سے جا کر اتا پتا معلوم کیا جائے۔ اس لو دھوپ میں سرور صاحب نے ہم لوگوں کو نہایت مشکوک نظروں سے دیکھا اور خیریت پوچھی۔ بہت ہمّت کر کے ایک صاحب نے بڑا ہی بنیادی سوال کیا۔

''سر! ہم لوگ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تنقید کس کو کہتے ہیں۔''

''ہاں بھئی! یہ ایک بات ہوئی۔''

سرور صاحب نے بڑی تفصیل سے نہایت سادہ و آسان طریقے سے اس طرح سمجھایا کہ موضوع کو پانی کر دیا جو ہمارے سروں پر سے گزر گیا۔

پھر ایک صاحب زادے نے جو آج کل ایک یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو، پروفیسر اور نامی گرامی نقاد واقع ہوئے ہیں، اپنی تسلی کے لیے پوچھا۔

''سر جو تنقید کرتا ہے اسے کیا کہتے ہیں؟''

''ناقد......!تنقید کرنے والا......نقاد۔''

ایک دوسرے صاحب زادے نے ٹکڑا لگایا۔

''اردو میں بے حد اہم نقاد کون کون ہیں؟''

''حالی،شبلی،عبدالحق،رشید احمد صدیقی،ڈاکٹر سید عبداللہ،کلیم الدین احمد،پروفیسر احتشام حسین وغیرہ۔کلیم الدین احمد کا نام سنتے ہی ہمارے چہرے گلاب کی طرح کِھل اٹھے۔ایک صاحب زادے نے پوچھا۔

''سر!یہ کلیم الدین احمد کی کیا اہمیت ہے کس قسم کے نقادوں میں ان کا شمار ہے؟''

''بھئی!موجودہ دور میں سچی بات تو یہ ہے کہ سب سے زیادہ اِنہی کا شہرہ ہے۔بہت ہی اہم نقّاد ہیں۔ان کی تنقید میں کچھ انتہا پسندی ہوتی بھی ہے،نہیں بھی ہوتی ہے۔کلیم صاحب اصولِ تنقید پر زور دیتے ہیں مگر خود اصولوں پر ذرا کم ہی چلتے ہیں،چلتے بھی ہیں۔ان کے یہاں توازن کی جگہ شدت ہے مگر توازن ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔کچھ صاف نہیں کہا جا سکتا۔ان کی گرفت بہت سخت ہوتی ہے اس لیے لوگ جھنجھلاتے بھی ہیں۔مگر باتیں بڑے پتے کی کرتے ہیں۔ان کی بھی اپنی ایک اہمیت ہے اور خوب ہے۔

غرض سرور صاحب بہت دیر تک کلیم الدین احمد کے میزانِ نقد کے دونوں پلڑے برابر کرتے رہے جس سے ہم لوگ صرف یہ اندازہ کر سکے کہ پروفیسر آل احمد سرور بھی ضربِ کلیم سے بے حد خائف ہیں اور کلیم الدین احمد ضرور دہشت پسند نقاد ہیں اور ہم لوگ وہاں سے سلام کر کے رخصت بلکہ منتشر ہو گئے۔

دو تین دن بعد ہم لوگ احتشام صاحب کے یہاں گئے تو دیکھا کہ وہی کتاب پھر ان کے ہاتھ میں ہے اور کافی خونخوار انداز سے ہے کہ اس پر ایک سرخ رنگ کا کور چڑھا ہوا تھا۔غالباً نئی خرید کر لائے تھے اور سوویت دیس کا ورق پھاڑ کر اس پر چڑھایا گیا تھا،جس پر ہنسیا،ہتھوڑا اور مزدور کے خون کی سرخی تھی۔

بات آئی گئی ہو گئی۔یہ بھی کسی کو یاد نہ رہا کہ وہ کتاب کن صاحب کے پاس پہنچی۔دن گزرتے رہے۔ایک دن معلوم ہوا کہ سرور صاحب کو بخار چڑھ گیا۔ہم لوگ دیکھنے گئے۔آنے والوں کی خاصی بھیڑ تھی۔عیادت کا انداز کچھ تعزیت والا تھا۔بار بار کلیم صاحب کا نام سنائی دیتا۔معلوم ہوا کہ تازہ ''نقوش''میں سرور صاحب کو کلیم صاحب نے دُھن ڈالا ہے۔اہلِ علم کا مجمع تھا۔اندازِ گفتگو میں ٹھہراؤ اور صبر وضبط کا ایسا انداز تھا گویا لکھنؤ کا قلعہ کلیم الدین نے ڈھا دیا ہے اور سالارِ قافلہ بیمارِ غم بنا ہوا ہے۔سامنے کتابِ عیادت کے طور پر''نقوش''رکھا ہوا تھا۔جسے لوگ اٹھا کر پڑھتے اور پھر کچھ دبا دبا سا تبصرہ کرتے۔اندازِ گفتگو کچھ تسلّی و ڈھارس

والا تھا۔ڈاکٹر احسن فاروقی گھر کا بھیدی بنے آپے بلکہ جامے سے باہر تھے اور بے طرح ناک میں ڈکرار ہے تھے اور جب وہ ناک میں منمنا کر کہتے :

''سرو سرو! کلیم الدین نے ینہ بانت تو ٹھینک کہیں ہیں۔''تو سرور صاحب کی کمزوری بڑھ جاتی اور وہ خلاف قاعدہ جھلاّتے نظر آتے۔سرور صاحب ہم لوگوں کو لفٹ ذرا کم ہی دیتے تھے اس لیے لڑکے لوگ کچھ خوش ہی تھے کہ کوئی تو انھیں ملا۔غرض عرصے تک کلیم صاحب کے اس مضمون کے چرچے رہے اور یہ بھی افواہ گرم ہوئی کہ سرور صاحب کلیم صاحب سے ملنے پٹنہ گئے ہیں۔ ایک صاحب زادے جو خود آج کل امریکہ میں پروفیسر ہیں،ان کا حلفیہ بیان تھا کہ خود برتھ ریزرو کرانے گئے تھے۔

رفتہ رفتہ یہ چرچے ختم ہوئے اور ان کی جگہ ہند پاک کرکٹ نے لے لی کہ اچانک بیٹھے بٹھائے کلیم صاحب نے دوسرا ایٹمی دھماکہ کر دیا۔ وہ یہ کہ تازہ ''نقوش''میں انھوں نے احتشام حسین کی تنقید نگاری پر مضمون سر کر دیا تھا۔ اس کا چھپنا تھا کہ کہرام مچ گیا۔لوگ جوق در جوق تعزیت کے لیے احتشام صاحب کے پاس پہنچنے لگے۔احتشام صاحب عجب سوگوارانہ انداز سے بیٹھے ہوئے تھے۔ایک طرف سے انھیں باقر مہدی سنبھالے ہوئے تھے دوسری طرف مرزا جعفر حسین اور ایک ان کے شاگرد جو آج کل نقاد ہو گئے ہیں۔ باقر وغیرہ کی آستینیں چڑھی ہوئی تھیں۔احتشام صاحب کبھی ٹھنڈا کرتے کبھی جھڑک دیتے۔ جوابی کارروائی کی دھمکی پر، سختی سے منع کرتے۔

''نھیں بھئی! بالکل کوئی ضرورت نہیں۔''

''معلوم نہیں کیسے کیا ہو جاتا ہے۔''

''خاموشی بہتر ہے۔معاملہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔الجھانے سے حاصل۔''

ہم نے تسلی دیتے ہوئے عرض کیا۔

''حضور! آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ کلیم صاحب نے آپ کو کم از کم ہاتھی تو مان لیا ہے کہ'' احتشام حسین جب آل احمد سرور کی نقل کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ہاتھی خوش فعلیاں کر رہا ہے۔''

اس پر ایک قہقہہ پڑا۔احتشام صاحب چند دن بیمار اور کئی دن جھنجھلائے رہے۔

جب علی گڑھ میں ایم۔اے کرنے کے دوران تنقید کے پرچے سے ہمارا سابقہ پڑا تو ہم نے کلیم الدین احمد کی کتابیں ''اردو تنقید پر ایک نظر''اور''اردو شاعری پر ایک نظر''غور سے پڑھیں۔اسی زمانے میں ہم نے اردو ناقدین کی ایک پیروڈی'' کپور کا فن'' کے عنوان سے لکھی۔ اس میں کلیم الدین احمد کے انداز بیان کا بھی چربہ اڑایا جو بے حد پسند کیا گیا۔سر سید ہال میگزین'' اسکالر'' کا

میں ایڈیٹر تھا، اس کا پیروڈی نمبر نکالا۔ پہلی بار یہ پیروڈی اس میں یا علی گڑھ میگزین میں شائع ہوئی تھی۔ کلیم صاحب کے ایک شاگرد ہمارے گہرے دوست تھے۔ ان کے اصرار پر ہم نے وہ رسالہ کلیم صاحب کو ڈاک سے بھیج دیا۔ ان صاحب کا کہنا تھا کہ کلیم صاحب کو خط کا جواب دینے کی عادت نہیں ہے مگر وہ بہت پڑھتے ہیں اور آپ کا مضمون ضرور پڑھیں گے اور پسند کریں گے۔ خلاف توقع چند دن بعد مجھے کلیم صاحب کا ایک خط ملا جس میں انھوں نے لکھا تھا۔

''مکرمی!

پرچہ کا شکریہ۔ ''کپور ایک مطالعہ'' پسند آیا۔ پیروڈی خوب ہے۔ اردو کے لیے یہ نئی چیز ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو مغربی ادب کے مطالعے میں دل چسپی ہے۔ اس فن کو ترقی دیں۔

آپ کا خیال غلط ہے۔ میں نے برا نہیں مانا۔ پیروڈی تو شہکاروں کی ہوتی ہے۔ یہ تو کارٹون کا فن ہے۔ آپ کا انداز استہزائیہ نہیں بلکہ اسلوب کو نمایاں کرنے کا ہے۔ اسے آپ جو اپنی کتاب شائع کرنا چاہتے ہیں اس میں ضرور شامل کریں۔ کتاب کے نام کی فرمائش مصروفیت کی نذر ہو گئی۔ آپ خود کوئی اچھا سا (مختصر) نام رکھ لیں۔ پٹنہ آئیں تو ضرور ملیں۔ ٹیلی فون کر لیں۔ قاضی صاحب خیریت سے ہیں۔ پیروڈی کی اطلاع پہلے انھوں نے دی تھی۔ وہ بھی خوش ہیں۔

کلیم الدین احمد''

ایک طالب علم کی اس سے بڑھ کر کیا حوصلہ افزائی ہو سکتی تھی۔ خوشی کے مارے برا حال تھا۔ احباب اور اساتذہ میں کئی دن کلیم صاحب کے خط کی نمائش کا سلسلہ جاری رہا اور بار بار دوستوں کو چائے پلانا پڑی۔

غالبؔ صدی تقریبات کا ہنگامہ پٹنہ یونیورسٹی میں برپا ہوا تو مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا۔ میں پروفیسر اختر اورینوی کا مہمان تھا۔ ان تقریبات کا افتتاح پروفیسر کلیم الدین احمد نے کیا تھا۔ بس وہ دو جملے بولے تھے اور سینیٹ ہال تالیوں سے گونج گیا تھا۔

''غالبؔ کے زمانے میں ان کی عزت افزائی جو کی گئی وہ ان کی حیثیت سے کم تھی اور اس زمانے میں جو عزت افزائی ہو رہی ہے وہ ان کی حیثیت سے زیادہ ہے۔''

میں نے پہلی بار انھیں بہت غور سے دیکھا۔ وہ مجھے نہایت سرخ و سپید تندرست قسم کے بزرگ لگے۔ بونا سا قد، لمبائی کے مقابلے میں چوڑان اطمینان بخش۔ نہایت سنجیدہ، متین، خاموش، لیے دیے، چہرے پر وقار اور آسودگی۔ خاموش بیٹھتے تو چہرہ تقریباً چوکور مگر بھرا بھرا۔ مسکراتے یا بات کرتے تو منہ گول ہو جاتا۔ غرض عام انسانی چہروں سے خاصا مختلف۔ جب اجلاس ختم ہوا اور لوگوں نے انھیں گھیرا تو میں نے بھی انھیں سلام کیا، جس کا جواب انھوں نے Face Expression سے دیا اور میں بس

دیکھتا ہی رہ گیا اور وہ چل دیے۔ ان کے ساتھ وائس چانسلر، ڈاکٹر ممتاز احمد، پروفیسر عطا کاکوی اور ڈاکٹر اختر اورینوی تھے، جو انھیں موڑ تک پہنچا کر واپس آ گئے۔ ہمارے ایک دوست نے بتایا کہ شام کو کلیم صاحب کے یہاں آپ لوگوں کے اعزاز میں ایک ایٹ ہوم ہے۔ آپ لوگ سے مراد ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر حسن، ڈاکٹر قاضی عبدالستار اور خاکسار۔

شام کو موٹروں پر اختر اورینوی صاحب کے یہاں سے ہم لوگ کلیم صاحب کے یہاں روانہ ہوئے، سڑک ابھی بن رہی تھی۔ فٹ پاتھ پر کنکر پتھر تھے۔ برآمدے میں لمبی لمبی میزیں، آمنے سامنے کرسیاں جن پر مہمان اور میزبان بیٹھ گئے۔ کلیم صاحب ایک کونے میں کھڑے مسکراہٹ سے لوگوں کے سلام اور باتوں کا جواب دے رہے تھے۔ جو نوجوان اس تقریب کے انتظام اور ہماری پذیرائی میں پیش پیش تھے وہ ڈاکٹر ممتاز احمد، ڈاکٹر محمد صدیق، ڈاکٹر خالد رشید صبا اور ڈاکٹر محمد طیب ابدالی تھے۔ طیب ابدالی بہت دبلے پتلے تھے اور ممتاز صاحب بالکل پہلوان معلوم ہوتے تھے اور نہایت تندرست۔ سر پر چھوٹے چھوٹے بال بھرا بھرا چہرہ کھلتا ہوا رنگ۔ سب سے زیادہ خوش پوشاک ڈاکٹر خالد رشید صبا اور ڈاکٹر صدیق تھے۔

میں ایک دفعہ کرسی سے اٹھ کر کلیم صاحب تک گیا مگر ان کی خاموشی نے پسپا کر دیا۔ پھر آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے ڈاکٹر اختر اورینوی سے کہا:

''بھئی! یہ تو بولتے ہی نہیں ہیں۔''

''خوب بولتے ہیں مگر اس کی ایک ترکیب ہے۔''

''وہ کیا؟''

ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ بولے

''کلیم صاحب ملازمت میں توسیع چاہتے ہیں مگر بیمار ہیں۔ بیماری چھپاتے ہیں۔ آپ ان سے صحت اور خیریت پوچھیے۔ ہارٹ، بلڈ پریشر، شوگر وغیرہ کے بارے میں، اور بلا کسی کا نام لیے کہیے کہ لوگوں نے بتایا کہ آپ بیمار ہیں۔ پھر دیکھیے کیسا بولتے ہیں۔''

غرض انھوں نے ٹھیل ٹھال کر ہمیں پھر کلیم صاحب کے پاس بھیج دیا۔ ہم نے اختر صاحب کے نسخے پر عمل کرتے ہوئے جا کر ان کی صحت کو کریدا۔ کلیم صاحب بولنے لگے۔ پہلے تو یقین دلایا کہ وہ قطعی تندرست ہیں۔ پھر بتایا کہ لوگ بدنام کرنے کے لیے ایسا کہتے ہیں۔ پھر میں نے اپنی نئی کتاب ''مضامینِ پاشا'' کے بارے میں کہا کہ لانا بھول گیا۔ بولے ''آپ کی یہ اور دوسری کتابیں میرے پاس ہیں۔ میں پڑھ چکا ہوں کچھ مضامین پر پسندیدگی کا اظہار بھی کیا۔ بولے ''ادب میں مارشل لا'' اور ''رستم امتحان کے میدان میں'' Prose میں Mass Epic ہیں۔ مختصر خاکے کے آرٹ پر بولے: ''بہت مشکل فن ہے۔ آپ کے خاکے پڑھ

چکا ہوں۔ یہ سلسلہ جاری رکھیے۔'' غرض وہ بول رہے تھے اور میں سن رہا تھا۔ جب میں لوٹا تو احباب نے حیرت سے پوچھا: ''کلیم صاحب آپ سے تو خوب باتیں کر رہے تھے۔'' اختر صاحب مسکرائے۔ ان کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔ میں بیماری کا ذکر گول کر گیا اور بولا:

''میری ظرافت کے فن پر روشنی ڈال رہے تھے۔ مضامین کی تعریف کر رہے تھے۔''

''تعجب ہے۔''

''تعجب تو مجھے بھی ہے۔''

جب لکھنؤ سے ہم نے سیوان میں ڈیرہ جمایا تو پٹنہ کے چکر شروع ہوگئے۔ جب بھی پٹنہ جاتے اور ذرا بھی فرصت ملتی تو کلیم صاحب کو ٹیلی فون کرتے اور وہ عموماً شام کا وقت دیتے۔ پھر کلیم صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ہمارا محتاط اندازہ ہے کہ وہ مردم شناس تو نہ تھے مگر بڑے مروت کے انسان تھے۔ عموماً عشا بعد لکھنا پڑھنا شروع کرتے جس کا سلسلہ عام طور پر صبح چار بجے تک چلتا۔ دس بجے کے قریب وہ سو کر اٹھتے۔

نیاز فتح پوری کی طرح کلیم الدین احمد بے حد با قاعدہ انسان تھے، اردو بورڈ کی لغت کا دفتر ان کے گھر پر تھا جس میں بہت سے لوگ کام کرتے۔ کلیم صاحب دن بھر پابندی سے بیٹھ کر کام کرتے۔ ان کے آفس میں دنیا بھر کی سیکڑوں ڈکشنریاں اور ڈکشنری سازی کا ہر قسم کا ساز و سامان تھا۔ وہ مشین کی طرح کام کرتے۔ دفتری اوقات میں ملاقاتی سے گفتگو تقریباً نہیں کے برابر ہوتی۔

کلیم صاحب تنہائی میں خوب باتیں کرتے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انھیں جنسی موضوعات اور اسکینڈلز میں بڑی دل چسپی تھی۔ وہ بہت کم کھلتے لیکن جب بے تکلف ہوجاتے تو خوب ہنستے بولتے۔ ساتھ میں اگر کوئی اجنبی ہو یا کسی نے ان کی عظمت کا قصیدہ پڑھ دیا تو وہ شرما کر بالکل خاموش ہوجاتے۔ کلیم صاحب کے مزاج میں مروّت اور دریا دلی بہت تھی۔ تنقید کے مزاج میں وہ جتنے گرم تھے روزمرہ کی زندگی میں اتنے ہی نرم۔ ہمیشہ سلوک کرنے کے لیے تیار رہتے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دو ایک سفارشیں ان سے کی تھیں۔ مجھے حیرت ہوئی کہ انھوں نے وہ کام بڑی خوش اسلوبی سے نہ صرف کر دیا بلکہ مجھے خط لکھ کر اس کی اطلاع بھی دے دی۔ یوں تو کلیم صاحب خوب باتیں کرتے بلکہ آخری زمانے میں صرف وہی بولتے تھے۔ کلیم صاحب اچھی طرح جانتے تھے کہ مجھے ان کے طریقۂ تنقید خاص طور پر اقبال کے سلسلے میں قطعی اختلاف ہے مگر اس کے باوجود اس کا تعلقات پر کبھی کوئی اثر نہ پڑا۔ ان میں اور قاضی عبدالودود میں کبھی نہ پٹی۔ بیش تر میں قاضی صاحب کے یہاں سے ان کو فون کرتا لیکن کبھی انھوں نے قاضی صاحب کے خلاف میری موجودگی میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

میں جب بھی کلیم صاحب سے ملنے جاتا تو وہ ''معاصر'' کا نیا شمارہ دیتے۔ اس کا مجھے ممبر بنایا، اس میں لکھنے کی فرمائش کرتے۔ اگر کبھی بھی کسی کتاب یا رسالے کے بارے میں دریافت کیا تو وہ لاکر کہتے ''لیجیے آپ کی نذر ہے۔'' اکثر انھوں نے بڑی قیمتی کتابیں مجھے ''نذر'' کردیں۔

ہمارے کالج کا مقدمہ ہائی کورٹ میں تھا۔ جسٹس فضل علی نے اس کی تحقیقات کلیم صاحب کے سپرد کی۔ مجھے اس کا علم تھا اور اس دوران برابر میں ان کے یہاں جاتا بھی تھا۔ مگر میں نے کبھی اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی۔ جب میں چلنے لگتا تو کلیم صاحب مجھے روک کر پھر باتیں کرنے لگتے۔ گھما پھرا کر سیوان کا ذکر کرتے مگر میں نے کالج کے سلسلے میں ان سے کوئی بات نہیں کی۔ انھوں نے یونس صاحب سے اس بات کی بڑی تعریف کی اور سیوان جاکر میرے یہاں قیام کرنے کا پروگرام بھی بنایا اور کہا کہ ''جمال صاحب سے انکوائری میں بڑی مدد ملے گی۔'' ان کے سیوان آنے سے چند یوم قبل اچانک وہ وفات پا گئے اور یہ باتیں مجھے خود ان کے گھر والوں اور یونس صاحب سے معلوم ہوئیں، جب میں ان کے انتقال کی ریڈیو سے خبر سن کر تعزیت کے لیے پٹنہ گیا۔

اب بھی ان کا خیال آتا ہے اور یاد آتا ہے کہ عالمی ادب یا انگریزی ادب پر میں نے انھیں چھیڑ دیا ہے اور وہ مسلسل بولے چلے جارہے ہیں اور محسوس ہوتا کہ علم ودانش کا ایک سمندر ابل رہا ہے۔ ان کی ہمارے لیے اس وجہ سے بھی ہمیشہ ایک اہمیت رہے گی کہ بہار کی شناخت ہمارے جن جواہر سے اردو دنیا کے خزانے میں ہوتی ہے ان میں کلیم الدین احمد کی حیثیت کوہ نور کی ہے۔ کلیم صاحب اصولِ تنقید پر زور دیتے تھے۔ متن اور شخصیت کے مطالعے پر ان کا زور تھا جس سے ہم بہت کچھ حاصل کرسکتے ہیں۔ ان کی تنقید کا انداز کچھ Demolition Expert کا تھا جس کی ادب میں ضرورت بھی ہے اور اہمیت بھی۔ بت سازی سب کچھ نہیں، بت شکنی بھی ادبی اور تاریخی سائیکل کا جز ولاینفک ہے۔ احتساب اور گرفت کا فن ان پر ختم ہوگیا۔ اب ضرورت یہ ہے کہ ان کے کارناموں کی ایڈیٹنگ اور تلخیص کی جائے تاکہ کام کی باتیں ہم گرہ میں باندھ سکیں اور بقیہ کی حیثیت تاریخی رہ جائے۔

کلیم صاحب کے علمی ذخیرے میں بڑی نادر ونایاب کتب ہیں۔ شیکسپیئر کے بیش تر پہلے ایڈیشن انھوں نے مجھے دکھائے تھے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس خزانے کو محفوظ کردیا جائے۔

مجھے اب بھی کلیم صاحب یاد آتے ہیں۔ خصوصاً ان کی کوئی کتاب میرے ہاتھ میں ہو یا پھر جب میں بہار اردو اکاڈمی جاتا ہوں اور راستے میں ان کا گھر پڑ جائے تو ایک دم مجھ پر اداسی چھا جاتی ہے اور ان کا چہرہ نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ بزرگوں میں جن سے بہت کچھ حاصل کیا ان میں وہ مجھے بہت عزیز ہیں۔

(احمد جمال پاشا)

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی

منہمک	:	مصروف، مشغول
مستغرق	:	ڈوبا ہوا، کسی کام میں کھویا ہوا
محتاط	:	احتیاط برتنے والا، بہت سنبھل کر کام کرنے والا
برہمی	:	غصّہ کرنا، ناراضگی
تکرار	:	لڑائی جھگڑا، تو تو میں میں
ژولیدہ بیانی	:	غیر مربوط گفتگو کرنا، بے سر پیر کی ہانکنا
ہجوِ ملیح	:	ایسی تعریف جس میں برائی کا پہلو نکلتا ہو
معمّہ	:	ایسی پہیلی جس کا حل آسان نہ ہو
مشکوک	:	جس پر شک کیا جائے
سالار	:	فوج کا سردار، قافلے کی رہبری کرنے والا
جوق در جوق	:	گروہ در گروہ، مجمع
چربہ	:	عکس، نقل
استہزائیہ	:	مسخرے پن کا انداز
متین	:	سنجیدہ، گمبھیر
Face Expression	:	چہرے کے تاثرات شکل سے نمایاں ہونا
توسیع	:	پھیلاؤ، اضافہ
مردم شناس	:	آدمی پہچاننے والا، تیز نظر رکھنے والا
دریا دلی	:	سخاوت، فیاضی

© NCERT not to be republished

نذر کرنا	:	پیش کرنا
کوہِ نور	:	روشنی کا پہاڑ، ایک بیش قیمت ہیرا
جزوِلاینفک	:	لازمی حصّہ، جسے الگ نہ کیا جا سکے
متن	:	کوئی بامعنی تحریر، کسی مصنف کے قلم سے نکلی ہوئی کوئی عبارت یا شعر
احتساب	:	محاسبہ کرنا، جائزہ لینا، گرفت، پکڑ
گرفت	:	پکڑ
نادر	:	انوکھا، کم یاب
نایاب	:	نہ ملنے والا، بہت مشکل سے ملنے والا

غور کرنے کی بات

- کلیم الدین احمد اردو کے معروف نقاد اور انگریزی زبان کے استاد تھے۔
- احمد جمال پاشا نے کلیم الدین احمد کا خاکہ لکھتے ہوئے اُن کے بعض مضامین اور کتابوں کے سلسلے میں اردو کے دو ادبی مراکز لکھنؤ اور علی گڑھ میں موجود ادیبوں کے تاثرات بھی اپنے دل چسپ انداز میں شامل کرکے اس خاکے کی معنویت بڑھا دی ہے۔ اس خاکے میں کلیم الدین احمد کے ساتھ ساتھ اُن کے چند معاصرین بالخصوص آل احمد سرور اور سید احتشام حسین کے احوال بھی موجود ہیں۔
- اس خاکے میں طنز و ظرافت کے ساتھ ساتھ تنقیدی نقطۂ نگاہ کو بھی احمد جمال پاشا نے روا رکھا ہے۔ وہ ہنسی ہنسی میں ہمیں کلیم الدین احمد کی ادبی حیثیت سے بھی آگاہ کرتے گئے ہیں۔

سوالات

1. احمد جمال پاشا نے کلیم الدین احمد کی تنقیدی اہمیت کے بارے میں کیا لکھا ہے؟
2. پیروڈی کے فن پر کلیم الدین احمد کے خیالات کیا ہیں؟ لکھیے۔
3. 'میزانِ نقد کے دونوں پلڑے برابر کرتے رہے'— اس کی تفصیل اس سبق کی روشنی میں بیان کیجیے۔

© NCERT not to be republished

4. احمد جمال پاشا نے کلیم الدین احمد کی ذاتی لائبریری کے بارے میں کون سی اطلاع دی ہے؟ بتائیے۔
5. اس خاکے میں اردو ادب سے متعلق جن شخصیات کا ذکر ہوا ہے، ان میں سے پانچ کے بارے میں تین تین جملے لکھیے۔

عملی کام

- اس خاکے سے ظریفانہ اور سنجیدہ حصّوں کو الگ الگ کر کے لکھیے۔
- احمد جمال پاشا کے کسی دوسرے خاکے یا مضمون کا مطالعہ کیجیے۔

© NCERT not to be republished

حصۂ نظم

- غزل
- نظم
- طویل نظم

© NCERT not to be republished

غزل

’’غزل‘‘ عربی زبان کا لفظ ہے۔لغت میں اس کے معنی ہیں ’’عورتوں کی باتیں کرنا‘‘ یا ’’عورتوں سے باتیں کرنا‘‘۔عرب شعرا جب اپنی معشوقاؤں کا سراپا کھینچتے یا ان کے حسن و جمال کی تعریف کرتے یا ان کی محبت میں اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے تو اس عمل کو ’’تغزّل‘‘ اور ایسے اشعار کو ’’غزل‘‘ کہتے تھے۔عربی میں غزل عشقیہ اشعار کو کہتے ہیں۔عربی غزل میں مطلع بھی ہوتا تھا اور غزل کی ہیئت کے مطابق دوسرے اشعار کے تمام مصرعے ہم قافیہ بھی ہوتے تھے۔غزل کا ہر شعر مستقل مضمون کا حامل نہیں ہوتا تھا۔

عربی سے غزل فارسی میں آئی۔ فارسی شاعروں نے غزل میں کئی بڑے کارنامے انجام دیے۔ایک یہ کہ انھوں نے غزل کے ہر شعر کو ایک مستقل مضمون کا حامل بنایا۔غزل کے ہر شعر میں ایک مستقل مضمون ادا کرنے کی کوشش کے نتیجے میں غزل کے اندر اشاروں اور کنایوں میں بات کرنے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ بڑے سے بڑے مضمون کو علامت، تشبیہ اور استعارے کے پردے میں صرف دو مصرعوں میں ادا کیا جانے لگا۔ فارسی شاعروں نے موضوعات و مضامین کے لحاظ سے غزل میں وسعت پیدا کی۔غزل میں عشق مجازی کے ساتھ ساتھ عشق الٰہی، بے ثباتیِ دنیا، زاہدوں سے چھیڑ چھاڑ، اہل ریا پر طنز اور رندی و مے خواری کے مضامین فارسی شاعروں ہی کی ایجاد ہیں۔غزل میں ’’ردیف‘‘ فارسی شاعروں کی دین ہے۔عربی شاعری میں قافیہ ہوتا ہے، ردیف نہیں ہوتی۔

اردو میں غزل فارسی ادب سے آئی ۔اب یہ اردو کی سب سے مقبول صنفِ سخن ہے۔ فارسی کی طرح اردو غزل میں بھی مضامین و موضوعات کی کوئی قید نہیں ہے۔فلسفیانہ، عاشقانہ، زاہدانہ ہر طرح کے مضامین نظم کیے جاسکتے ہیں اسی طرح اشعار کی تعداد بھی مقرّر نہیں ہے۔ عام طور پر پانچ سے اُنیس اشعار تک کی غزلیں ہوتی ہیں۔

غزل کا پہلا شعر ’’مطلع‘‘ کہلاتا ہے، جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ اگر کسی غزل میں دوسرا مطلع بھی ہو تو اسے ’’حسنِ مطلع‘‘ یا ’’ زیبِ مطلع‘‘ کہتے ہیں۔غزل کے آخری شعر میں شاعر اپنا تخلص نظم کرتا ہے، جسے ’’مقطع‘‘ کہتے ہیں۔جس غزل میں ردیف نہ ہو، صرف قافیے ہوں اسے ’’غیر مردّف غزل‘‘ کہتے ہیں۔ وہ بحر اور ردیف وقافیہ جس کی غزل میں پابندی کی جاتی ہے، اس کو غزل کی ’’زمین‘‘ کہا جاتا ہے۔

غزل کے اشعار میں الگ الگ مضمون بیان کرنے کی رسم کو بعض لوگوں نے ناپسندیدگی اور نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اس کا عیب نہیں، حسن ہے۔

© NCERT not to be republished

الطاف حسین حالؔی

1837 تا 1914

حالؔی پانی پت میں پیدا ہوئے۔ ابھی وہ نو سال کے تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا۔ نوعمری ہی میں شادی بھی ہوگئی۔ تحصیلِ علم کے شوق میں دہلی چلے آئے۔ یہاں انھوں نے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ اسی دوران غالبؔ سے ان کی ملاقات ہوئی اور انھوں نے اردو و فارسی کا کچھ کلام بہ غرضِ اصلاح انھیں دکھلایا۔ اس کے علاوہ غالبؔ سے فارسی کے کچھ قصائد پڑھے لیکن سال ڈیڑھ سال بعد ہی اہلِ خانہ کے دباؤ کی وجہ سے انھیں وطن لوٹنا پڑا۔

1863 میں وہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ، رئیسِ جہانگیر آباد، ضلع بلند شہر سے وابستہ ہوگئے۔ یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔ شیفتہؔ ممتاز عالم، اردو فارسی کے خوش فکر شاعر اور صاحبِ ذوق انسان تھے۔ ان کی صحبت میں حالؔی کا ادبی مذاق اور نکھر گیا۔ اس درمیان غالبؔ اور دہلی سے بھی ان کا ربط برابر قائم رہا۔

1872 میں وہ لاہور چلے گئے۔ وہاں انھیں گورنمنٹ بک ڈپو میں ملازمت مل گئی۔ ان کا کام یہ تھا کہ وہ انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی عبارت درست کردیا کریں۔ اس طرح انھیں زبان و ادب سے متعلق مغربی خیالات اور بعض جدید علوم سے واقفیت حاصل کرنے کا موقع ملا۔ یہیں سے ان کے ذہن میں اردو نثر و نظم کی اصلاح کا خیال بھی آیا۔ جب کرنل ہالرائڈ نے لاہور میں ''انجمنِ پنجاب'' کے مشاعروں کی بنیاد ڈالی تو حالؔی نے اس میں نمایاں طور پر حصّہ لیا۔ حالؔی کو محمد حسین آزادؔ کے ساتھ جدید اردو نظم کے بنیاد گزاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

حالؔی نے اردو میں نئے انداز کی سوانح عمریوں کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ ''حیاتِ سعدی'' (1886) ''یادگارِ غالب'' (1894) اور ''حیاتِ جاوید'' (1901) ان کی مشہور سوانح عمریاں ہیں۔

1893 میں انھوں نے اپنا دیوان مرتّب کیا تو اس کے شروع میں ایک مقدمہ بھی لکھا جو ''مقدمۂ شعر و شاعری'' کے نام سے معروف ہے۔ اس کی اہمیت یہ ہے کہ شاعری کی تنقید پر یہ اردو کی پہلی باقاعدہ کتاب ہے۔

حالؔی نظم کے علاوہ غزل کے بھی اچھے شاعر تھے۔ ان کی غزلوں میں لہجے کا دھیما پن، مبالغے سے پرہیز، گفتگو کا انداز اور محاورے کی چاشنی نمایاں ہیں۔

© NCERT not to be republished

5257CH17

غزل

اب بھاگتے ہیں سایۂ عشقِ بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

خود رفتگیِ شب کا مزا بھولتا نہیں
آئے ہیں آج آپ میں یا رب کہاں سے ہم

اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو
کچھ پا گئے ہیں آپ کی طرزِ بیاں سے ہم

دلکش ہر ایک قطعۂ صحرا ہے راہ میں
ملتے ہیں جاکے دیکھیے کب کارواں سے ہم

لذّت ترے کلام میں آئی کہاں سے یہ
پوچھیں گے جاکے حالؔیِ جادو بیاں سے ہم

(الطاف حسین حالؔی)

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی

بتاں	:	بُت کی جمع، مراد حسین اور خوب صورت
خودرفتگی	:	بے خودی، آپے میں نہ رہنا
بگاڑ	:	خرابی، ناراضگی
طرز	:	انداز
قطعہ	:	ٹکڑا
کارواں	:	قافلہ
جادوبیاں	:	جادو جیسے اندازِ بیان والا، جس کی باتیں جادو کی طرح اثر کریں
کلام	:	شاعری

غور کرنے کی بات

- ''سائے سے بھاگنا'' یہ محاورہ ہے جس کے معنی ہیں بہت زیادہ خوف زدہ ہوجانا۔ پرانی شاعری میں یہ تصور عام تھا کہ دنیا کی تمام چھوٹی بڑی تبدیلیاں آسمان کی گردش کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اسی تصور کے تحت اس شعر میں آسمان سے ڈرنے کی بات کہی گئی ہے۔ غالبؔ کے درج ذیل شعر میں بھی اسی طرف اشارہ ہے:

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

- ''خودرفتگی'' (مدہوشی) اور آپ میں آنا'' (ہوش مندی) معنی کے لحاظ سے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ بلاغت کی اصطلاح میں اسے ''تضاد'' کہتے ہیں۔ اس طرح کے متضاد الفاظ کو کلام میں سلیقے کے ساتھ جمع کرنا بھی حسنِ کلام کا ذریعہ ہے۔
- شعر نمبر تین میں مکالمے اور گفتگو کا انداز بہت خوب ہے۔ ''طرز'' کا لفظ یہاں مؤنث استعمال ہوا ہے۔ عام طور پر اسے مذکر بولتے ہیں۔

© NCERT not to be republished

- شعر نمبر چار: ''قطعہ'' اصطلاح میں ایک صنفِ سخن کا نام ہے لیکن لغت میں اس کے اصل معنی ٹکڑے کے ہیں۔ پہلی قسم کے معنی کو'' اصطلاحی معنی'' اور دوسری قسم کے معنی کو'' لغوی معنی'' کہتے ہیں۔ اس شعر میں یہ لفظ لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے۔
- شعر نمبر پانچ: اس غزل کا مقطع ہے، شاعر نے اس میں اپنا تخلص نظم کیا ہے۔ مقطع میں کبھی کبھی شاعر اپنی تعریف بھی کرتا ہے۔ اصطلاح میں اسے ''تعلّی'' کہتے ہیں۔ حالؔی کی غزل کا یہ مقطع بھی شاعرانہ تعلّی کا نمونہ ہے۔

سوالات

1. شاعر، دل سے اور آسمان سے کیوں ڈرا ہوا ہے؟
2. خود کلامی کا مطلب کیا ہے؟
3. اس غزل کے مقطعے کا مقابلہ غالبؔ کے درج ذیل مقطعے سے کیجیے اور بتائیے کہ دونوں میں کون سی بات مشترک ہے؟

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

عملی کام

- حالؔی کے ''مقدمۂ شعر و شاعری'' کا نسخہ حاصل کیجیے اور اس میں شعر کی جو خوبیاں بیان کی گئی ہیں اور شاعری کے لیے جو شرطیں بتائی گئی ہیں انھیں اپنے استاد سے پوچھ کر لکھیے۔

© NCERT not to be republished

آرزو لکھنوی

1872تا1951

سیدانور حسین آرزو، لکھنؤ کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد کا نام میرزا ذاکر حسین تھا۔ وہ بھی شعر کہتے اور یاس تخلص کرتے تھے۔ آرزو نے فارسی اور اپنے زمانے کے دوسرے علوم کی تعلیم لکھنؤ میں پائی۔ خاص طور پر عروض اور قواعد میں مہارت پیدا کی۔ میر ضامن علی جلال لکھنوی اس وقت کے مشہور شاعر تھے۔ آرزو نے ان کی شاگردی اختیار کی۔ شاعری کے علاوہ ان سے زبان و بیان کے نکات بھی سیکھے۔ استاد کی وفات کے بعد ان کے جانشین قرار پائے۔

اس زمانے میں کلکتے اور بمبئی میں تھیٹر کی متعدد کمپنیاں قائم تھیں۔ آرزو نے ان کے لیے کئی ڈرامے مثلاً ''متوالی جوگن''، ''دل جلی بیراگن''، وغیرہ لکھے، فلموں کے لیے بھی کچھ گیت لکھے۔ ''نظامِ اردو'' اردو زبان سے متعلق ان کا اہم رسالہ ہے۔ ان کے کلام کے چار مجموعے شائع ہوئے ہیں: ''فغانِ آرزو''، ''جہانِ آرزو''، ''بیانِ آرزو'' اور ''سریلی بانسری''۔

آزادی سے پہلے مہاتما گاندھی 'ہندوستانی' کا پرچار کر رہے تھے، یعنی کہ ایسی زبان جس میں سنسکرت یا عربی و فارسی کے ثقیل الفاظ نہ ہوں۔ آرزو نے اس سے متاثر خالص اردو، کی اصطلاح نکالی اور ''سریلی بانسری'' کے نام سے ایک ایسا شعری مجموعہ مرتب کر دیا جس میں فارسی عربی کے مشکل الفاظ نہیں ہیں۔ اس بات کی بڑی شہرت ہوئی اور اسے آرزو لکھنوی کا امتیاز سمجھا گیا۔ آرزو لکھنوی کا شمار ان باکمالوں میں ہوتا ہے جنھوں نے لکھنوی غزل کے رنگ کو نکھارا اور اسے ایک نئی اور سادہ زبان دی۔

© NCERT not to be republished

5257CH18

غزل

اول شب وہ بزم کی رونق، شمع بھی تھی پروانہ بھی
رات کے آخر ہوتے ہوتے ختم تھا یہ افسانہ بھی

ہاتھ سے کس نے ساغر پٹکا موسم کی بے کیفی پر
اتنا برسا ٹوٹ کے پانی، ڈوب چلا مے خانہ بھی

ایک لگی کے دو ہیں اثر اور دونوں حسبِ مراتب ہیں
لو جو لگائے شمع کھڑی ہے، رقص میں ہے پروانہ بھی

دونوں جولاں گاہِ جنوں ہیں بستی کیا ویرانہ کیا
اُٹھ کے چلا جب کوئی بگولا، دوڑ پڑا دیوانہ بھی

حسن وعشق کی لاگ میں اکثر چھیڑ اُدھر سے ہوتی ہے
شمع کا شعلہ جب لہرایا اُڑ کے چلا پروانہ بھی

(آرزو لکھنوی)

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ ومعنی

اول شب	:	رات کا پہلا پہر
بےکیفی	:	بےلطفی، جس میں کوئی مزا نہ ہو
حسبِ مراتب	:	مرتبے کے مطابق
رقص	:	ناچ
جولاں گاہِ جنوں	:	وہ دشت یا میدان جہاں دیوانگی کا اظہار کیا جاسکے

غور کرنے کی بات

- اردو شعر وادب کی تاریخ میں دکن، دہلی اور لکھنؤ بڑے ادبی مراکز تسلیم کیے جاتے ہیں۔ انھیں ادبی اصطلاح میں عام طور پر ادبی ''دبستان'' کہتے ہیں۔
- آرزوؔ لکھنوی دبستانِ لکھنؤ کی آخری نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ بیسویں صدی میں یہ تفریق ختم ہوگئی۔ اب اس طرح کے دبستان کا کوئی وجود نہیں ہے۔

سوالات

1. دبستانِ لکھنؤ کے پانچ شعرا کے نام لکھیے۔
2. آرزوؔ لکھنوی کی غزل کے امتیازات کیا ہیں؟
3. صنعتِ تضاد کسے کہتے ہیں؟ اس غزل کے کن مصرعوں میں اس صنعت کو برتا گیا ہے؟

عملی کام

- مجموعہ ''سریلی بانسری'' تلاش کیجیے اور اس کی کسی پسندیدہ غزل کو یاد کر کے جماعت میں سنائیے۔
- آرزوؔ لکھنوی کی اس غزل سے دو ایسے اشعار کا انتخاب کیجیے جن میں عربی اور فارسی الفاظ سب سے کم استعمال کیے گئے ہوں۔

© NCERT not to be republished

معین احسن جذبیؔ

1912 تا 2004

معین احسن جذبیؔ مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ جھانسی، لکھنؤ، آگرہ اور دہلی میں تعلیم حاصل کی۔ ایم۔اے پاس کرنے کے بعد بغرض ملازمت مختلف شہروں میں قیام کیا۔ اردو کے استاد کی حیثیت سے شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے وابستہ ہوئے اور وہیں انتقال ہوا۔

شاعری کا شوق بچپن سے تھا۔ ابتدائی دور میں تخلص ملالؔ تھا، بعد میں جذبیؔ اختیار کرلیا۔ ''فروزاں''، ''سخنِ مختصر'' اور ''گدازِ شب'' کے نام سے تین شعری مجموعے شائع ہوئے۔ ''حالیؔ کا سیاسی شعور'' جذبی کا تحقیقی مقالہ ہے، جس پر انھیں پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری ملی۔ انھیں ''اقبال سمّان'' اور ''غالب ایوارڈ'' پیش کیا گیا۔

جذبیؔ ترقی پسند دور کے اہم غزل گویوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انھوں نے نظمیں بھی کہی ہیں لیکن ان کا امتیاز غزل کی صنف میں قائم ہوا۔ جذبیؔ کی شاعری کا خاص وصف اس کا دھیما پن، حزن آمیز غنائیت اور کلاسیکی رچاؤ ہے۔

© NCERT not to be republished

5257CH19

غزل

زندگی ہے تو بہر حال بسر بھی ہوگی
شام آئی ہے تو آئے کہ سحر بھی ہوگی
پرسشِ غم کو وہ آئے تو اک عالم ہوگا
دیدنی کیفیتِ قلب و جگر بھی ہوگی
منزلِ عشق پہ یاد آئیں گے کچھ راہ کے غم
مجھ سے لپٹی ہوئی کچھ گردِ سفر بھی ہوگی
ہوگا افسردہ ستاروں میں کوئی نالۂ صبح
غنچہ و گل میں کہیں بادِ سحر بھی ہوگی
دل اگر دل ہے تو جس راہ پہ لے جائے گا
درد مندوں کی وہی راہ گزر بھی ہوگی

(معین احسن جذبی)

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی

پرسش	:	پوچھنا، دریافت کرنا
دیدنی	:	دیکھنے کے لائق
کیفیت	:	حالت
گردِ سفر	:	سفر کا غبار
نالۂ صبح	:	صبح کے وقت کی جانے والی آہ وفریاد

غور کرنے کی بات

- مطلع میں شاعر نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ جس طرح ہر شام ختم ہوجاتی ہے اور پھر نئی صبح طلوع ہوتی ہے، اسی طرح زندگی بھی اچھی بری بسر ہو ہی جائے گی۔
- شاعر نے کہا ہے کہ محبوب اگر آئے تو ایک عالم ہوگا۔ عالم ہونے کا مطلب ہے ایک خاص کیفیت کا پیدا ہونا۔
- تیسرے شعر میں شاعر نے منزلِ عشق پر پہنچنے کا ذکر کیا ہے لیکن یہاں یہ اشارہ پوشیدہ ہے کہ اُس وقت تک راستے کے غم شخصیت کو تبدیل کر چکے ہوں گے۔
- آخری شعر میں شاعر کا کہنا ہے کہ دل اگر واقعی دل ہے تو انسان میں دردمندی کا وصف ضرور پیدا کرے گا یعنی انسان کو اس راستے پر لے جائے گا جہاں وہ دوسروں کے دکھ درد کو سمجھ سکے۔

سوالات

1. ”زندگی ہے تو بہرحال بسر بھی ہوگی“ سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

2. افسردہ ستاروں میں نالۂ صبح کے ہونے کا مطلب کیا ہے؟

3. دردمندوں کی راہ گزر کون سی ہے؟

عملی کام

- غزل میں مندرجہ ذیل تراکیب استعمال ہوئی ہیں:

پرسشِ غم، کیفیتِ قلب وجگر، منزلِ عشق، گردِ سفر، نالۂ صبح، بادِ سحر، راہ گزر، اپنی کتاب سے ایسی ہی کچھ اور ترکیبیں تلاش کرکے لکھیے۔

© NCERT not to be republished

جاں نثار اختؔر

1914 تا 1976

سیّد جاں نثار حسین رضوی نام، اختؔر تخلّص تھا۔ آبائی وطن قصبہ خیرآباد، (اترّپردیش) تھا۔ جاں نثار اختؔر گوالیار میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد مضطؔر خیرآبادی مشہور شاعر تھے۔ انھوں نے دسویں جماعت تک تعلیم گوالیار کے وکٹوریہ کالجئیٹ ہائی اسکول میں حاصل کی۔ علی گڑھ سے بی اے اور ایم۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد وکٹوریہ کالج، گوالیار میں اردو کے لیکچرر ہوگئے۔ تقسیمِ ملک سے کچھ پہلے بھوپال چلے گئے، وہاں حمیدیہ کالج میں بہ حیثیت صدرِ شعبۂ اردو ان کا تقرر ہوگیا۔ کچھ دنوں بعد بھوپال سے بمبئی چلے گئے۔ وہیں اُن کا انتقال ہوا۔

جاں نثار اختؔر نے نظمیں، غزلیں اور رباعیاں کہی ہیں۔ وطنی، قومی اور سیاسی نظموں میں ان کے جذبات اور لہجے کی لطافت کا احساس ہوتا ہے۔ ''سلاسل''، ''تارِ گریباں''، ''نذرِ بتاں''، ''جاوداں''، ''گھر آنگن''، ''خاکِ دل'' اور ''پچھلے پہر'' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ انھوں نے کئی فلموں کے گیت بھی لکھے۔ ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں ''سوویت لینڈ نہرو'' اعزاز پیش کیا گیا۔

© NCERT not to be republished

5257CH20

غزل

جب لگیں زخم تو قاتل کو دعا دی جائے
ہے یہی رسم تو یہ رسم اٹھا دی جائے

دل کا وہ حال ہوا ہے غمِ دوراں کے تلے
جیسے اک لاش چٹانوں میں دبا دی جائے

ہم نے انسانوں کے دکھ درد کا حل ڈھونڈ لیا
کیا بُرا ہے جو یہ افواہ اڑا دی جائے

ہم کو گزری ہوئی صدیاں تو نہ پہچانیں گی
آنے والے کسی لمحے کو صدا دی جائے

اُنھی گلرنگ دریچوں سے سحر جھانکے گی
کیوں نہ کِھلتے ہوئے زخموں کو دعا دی جائے

ہم سے پوچھو کہ غزل کیا ہے، غزل کا فن کیا
چند لفظوں میں کوئی آگ چھپا دی جائے

(جاں نثار اخترؔ)

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی

گل رنگ	:	گلابی رنگ کے
افواہ اڑانا	:	غلط خبر پھیلانا
دریچہ	:	کھڑکی

غور کرنے کی بات

- اس غزل کے چوتھے شعر میں دو لفظ ''صدیاں'' اور ''صدا'' استعمال ہوئے ہیں۔ بہ ظاہر ان دونوں کی اصل ایک معلوم ہوتی ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں۔ جب اس قسم کے الفاظ کسی شعر یا عبارت میں جمع ہو جائیں تو ایک صنعت پیدا ہو جاتی ہے جسے ''شبہِ اشتقاق'' کہتے ہیں۔
- پانچویں شعر میں شاعر نے '' کھلتے ہوئے زخموں'' کو'' گل رنگ دریچے'' کہا ہے۔ جب شاعر دو چیزوں کے درمیان اس قسم کی مشابہت ظاہر کرتا ہے تو اس عمل کو'' تشبیہ'' کہتے ہیں۔

سوالات

1. غزل کے پہلے شعر میں شاعر کیا کہنا چاہتا ہے؟
2. زخم، قاتل، لاش، غم کے مناسبات کو کیا کہیں گے؟
3. گل رنگ دریچوں سے کیا مراد ہے؟

عملی کام

- جاں نثار اختؔر کے کچھ شعر یاد کیجیے۔

© NCERT not to be republished

ناصؔر کاظمی

1925 تا 1972

ناصؔر کاظمی کی پیدائش انبالہ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد وہ لاہور چلے گئے جہاں تقسیمِ ہند کے بعد انھوں نے مستقل سکونت اختیار کرلی۔ لاہور کی ادبی فضا میں ناصؔر کاظمی کی شاعری خوب چمکی۔ کچھ مدّت تک وہ ''اَوراقِ نو'' اور ''ہمایوں'' کے مدیر بھی رہے۔ 47 برس کی عمر میں جب اُن کی شاعری شباب پر تھی، اُن کا انتقال ہوگیا۔ اُن کی غزلوں کے مشہور مجموعے ''برگِ نے'' (1954) اور ''دیوان'' (1957) ہیں۔ تیسرا مجموعہ ''پہلی بارش'' انتقال کے بعد 1975 میں شائع ہوا۔ ان کی نظموں کا مجموعہ ''نشاطِ خواب'' ہے۔ تنقیدی مضامین اور مختصر نثری تحریریں ''خشک چشمے کے کنارے'' کے نام سے یکجا کردی گئی ہیں۔ ناصؔر کاظمی نے ایک کتھا کہانی ''سُر کی چھایا'' بھی لکھی تھی۔ ناصؔر کاظمی کی ڈائری بھی مرتّب کرکے شائع کی جاچکی ہے۔

ناصؔر کاظمی جدید غزل کے نمائندہ شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ میر تقی میؔر کی غزل سے وہ براہ راست بھی متاثر ہوئے اور انھوں نے یہ اثر فراؔق گورکھ پوری کے واسطے سے بھی قبول کیا۔ اُن کی غزل اپنے دھیمے لہجے، دبے دبے دَرد اور جدید طرزِ احساس کی وجہ سے ممتاز ہے۔ انھوں نے اردو غزل کی داخلیت اور دروں بینی کو بیسویں صدی کے یاس انگیز ماحول کے ساتھ پیش کیا ہے۔

© NCERT not to be republished

5257CH21

غزل

یہ شب، یہ خیال و خواب تیرے
کیا پھول کھلے ہیں، منھ اندھیرے

شعلے میں ہے ایک رنگ تیرا
باقی ہیں تمام رنگ میرے

آنکھوں میں چھپائے پھر رہا ہوں
یادوں کے بجھے ہوئے سویرے

دیتے ہیں سراغ فصلِ گُل کا
شاخوں پہ جلے ہوئے بسیرے

منزل نہ ملی تو قافلوں نے
رستے میں جما لیے ہیں ڈیرے

جنگل میں ہوئی ہے شام ہم کو
بستی سے چلے تھے منھ اندھیرے

رودادِ سفر نہ چھیڑ ناؔصر
پھر اشک نہ تھم سکیں گے میرے

(ناؔصر کاظمی)

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی

سراغ	:	پتا، کھوج
فصلِ گُل	:	موسمِ بہار
ڈیرہ	:	ٹھکانا، رہنے کی جگہ
رودادِ سفر	:	سفر کی کہانی

© NCERT not to be republished

غور کرنے کی بات

- منھ اندھیرے یعنی صبح کا وہ وقت جب اُجالا پوری طرح نہیں پھیلا ہوتا ہے، شاعر نے اس لفظ کو مطلع اور چھٹے شعر میں بطور قافیہ استعمال کیا ہے اور اسے بالترتیب شب اور شام کے متضاد کے طور پر برتا ہے۔
- خزاں کے بعد بہار بھی ضرور آتی ہے۔ چوتھے شعر میں شاعر نے شاخوں پہ جلے ہوئے بسیروں کا ذکر کرکے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اب فصلِ گُل بھی آنے والی ہے۔
- یہ غزل تقسیم کے بعد شاعر کے ہجرت کے تجربے کی روشنی میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔

سوالات

1. مطلع میں صبح سویرے کھِلنے والے کن پھولوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے؟
2. یادوں کے بجھے ہوئے سویروں سے کیا مُراد ہے؟
3. راستے میں ڈیرے جمالینے سے کیا مطلب ہے؟

عملی کام

- ہندوستان کی تقسیم کے بعد ہجرت کے تجربے کے بارے میں ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

راجندر منچندا باؔنی

1932 تا 1981

باؔنی کا پورا نام راجندر منچندا تھا اور باؔنی تخلص ۔وہ ملتان میں پیدا ہوئے۔ابتدائی اور ثانوی تعلیم انھوں نے آزادی سے پہلے ملتان ہی میں حاصل کی۔آزادی کے بعد وہ اپنے خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ دہلی منتقل ہوگئے۔یہاں بھی انھوں نے درس و تدریس کا پیشہ اختیار کرلیا۔ملازمت کے دوران معاشیات میں ایم۔اے کیا۔ان کا انتقال دہلی میں ہوا۔

باؔنی کا تعلق اردو کے نئے شاعروں کی اُس نسل سے ہے،جس نے ناؔصر کاظمی اور خلیل الرحمٰن اعظمی کے بعد غزل کو ایک نیا رنگ و آہنگ عطا کیا۔ان کی غزل ایک نئے طرزِ احساس کی نمائندگی کرتی ہے۔باؔنی کے اشعار میں دھندلکے کی کیفیت نمایاں ہے۔ ان کی زبان و بیان میں بھی تازگی بہت ہے۔نئے پن کے باجود ان کی شاعری میں کلاسیکی لب ولہجہ ملتا ہے۔وہ نت نئے مضامین پیدا کرتے ہیں اور نئی اردو غزل کی روایت میں اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔باؔنی کی شاعری نے ان کے بعد کے غزل گویوں کو بھی متاثر کیا ہے۔

© NCERT not to be republished

5257CH22

غزل

زماں مکاں تھے مرے سامنے بکھرتے ہوئے
میں ڈھیر ہوگیا طولِ سفر سے ڈرتے ہوئے

دِکھا کے لمحۂ خالی کا عکسِ لاتفسیر
یہ مجھ میں کون ہے، مجھ سے فرار کرتے ہوئے

بس ایک زخم تھا دل میں جگہ بناتا ہوا
ہزار غم تھے مگر بھولتے بسرتے ہوئے

وہ ٹوٹتے ہوئے رشتوں کا حُسنِ آخر تھا
کہ چپ سی لگ گئی دونوں کو بات کرتے ہوئے

عجب نظارا تھا بستی کا اس کنارے پر
سبھی بچھڑ گئے دریا سے پار اُترتے ہوئے

میں ایک حادثہ بن کر کھڑا تھا رستے میں
عجب زمانے مرے سر سے تھے گزرتے ہوئے

(راجندر منچندا بانی)

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی

زماں	:	زمانہ، وقت
مکاں	:	جگہ
طولِ سفر	:	سفر کی لمبائی
عکسِ لاتفسیر	:	ایسا عکس جس کی وضاحت ممکن نہ ہو
بسرنا	:	بھولنا
حسنِ آخر	:	اپنی کشش کھوتا ہوا حسن
سر سے گزرنا	:	مصیبتوں کی طرح نازل ہونا، جھیلنا

غور کرنے کی بات

- اردو غزل کی دو روایتیں ہیں: ایک پرانے خاص انداز کی غزل جسے کلاسیکی غزل کہتے ہیں۔ دوسری جدید غزل جس کا سلسلہ 1960 کے بعد شروع ہوتا ہے۔ باؔنی جدید غزل کے نمائندہ شاعر ہیں۔ ان کی شاعری کا مطالعہ اسی پس منظر میں کیا جانا چاہیے۔

سوالات

1. زماں و مکاں کے بکھرنے کا کیا مطلب ہے؟
2. ''رشتوں کا حسنِ آخر'' سے کیا مراد ہے؟
3. شاعر نے اپنے آپ کو ''حادثہ'' کیوں کہا ہے؟

عملی کام

- اس غزل کے دو شعر زبانی یاد کیجیے۔

© NCERT not to be republished

نظم

''نظم'' عربی زبان کا لفظ ہے۔لُغت میں اس کے معنی ہیں ''لڑی میں موتی پرونا''۔ اس کے دوسرے معنی ہیں ''انتظام، ترتیب، آرائش''۔ یہ مجازی معنی ہیں اور پہلے معنی سے برآمد ہوئے ہیں۔ ادبی اصطلاح کے طور پر ''نظم'' کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک تو یہ لفظ نثر کی ضد کے طور پر بولا جاتا ہے۔یعنی ہر وہ کلام جو نثر نہ ہو نظم ہے۔نظم کا دوسرا مفہوم مخصوص ومحدود ہے۔اس کے مطابق نظم شاعری کی اس صنف کو کہتے ہیں جس میں کسی خاص موضوع پر تسلسل کے ساتھ اظہارِ خیال کیا جائے۔

نظم عام طور پر کسی ایک موضوع سے متعلق ہوتی ہے، خاص صورتوں میں کسی نظم میں ایک سے زیادہ موضوعات بھی ہو سکتے ہیں لیکن یہ سب کسی بنیادی موضوع سے مربوط ہوتے ہیں۔نظم کا ایک مرکزی خیال ہوتا ہے جس کے گرد پوری نظم گردش کرتی ہے۔ ارتقا یعنی موضوع کا تسلسل اور پھیلاؤ بھی نظم کی اہم خصوصیت ہے۔طویل نظموں میں ارتقا واضح ہوتا ہے جب کہ مختصر نظموں میں یہ اکثر و بیشتر ایک تاثر کی شکل میں ابھرتا ہے۔نظم کی ان خصوصیات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں ''غزل'' کے علاوہ شاعری کی جتنی اصناف ہیں وہ سب نظم میں داخل ہیں لیکن اپنی الگ الگ خصوصیات کی بنا پر کچھ اصناف کے نام متعین ہو گئے ہیں۔ مثلاً قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی، قطعہ وغیرہ۔

صنف سخن کے لحاظ سے نظم کی اصطلاح ایک جدید تصور ہے۔اسی لیے اکثر نظم کے لیے ''نظم جدید'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ نظم کے لیے نہ تو ہیئت کی کوئی قید ہے اور نہ موضوع کی۔ موجودہ دور میں ہیئت کے اعتبار سے نظم کی تین قسمیں مقرر کی گئی ہیں:

پابند نظم:

ایسی نظم جس میں بحر کے استعمال اور قافیوں کی ترکیب میں مقررہ اصولوں کی پابندی کی گئی ہو، پابند نظم کہلاتی ہے۔ مُربع، مُخمّس، مُسدّس، ترکیب بند، ترجیع بند، گیت، وغیرہ بھی پابند نظم کی ہی مختلف شکلیں ہیں۔

© NCERT not to be republished

نظمِ مُعَرّا:

ایسی نظم جس کے تمام مصرعے وزن کے لحاظ سے برابر ہوں، مگر قافیہ نہ ہو، نظمِ معرّا کہلاتی ہے۔

آزاد نظم :

ایسی نظم جس میں نہ تو قافیے کی پابندی کی گئی ہو اور نہ بحر کے استعمال میں مروّجہ اصولوں کا لحاظ رکھا گیا ہو بلکہ مصرعے چھوٹے بڑے ہوں، آزاد نظم کہلاتی ہے۔ انگریزی میں آزاد نظم کے لیے Free Verse کی اصطلاح رائج ہے۔ اردو میں آزاد نظم کا رواج انگریزی نظم کی تقلید کے باعث ہوا۔ 19 ویں صدی کے اواخر میں، جب ہندوستان میں انگریزوں کا عمل دخل بڑھا اور انگریزی زبان و ادب کے اثرات پھیلنے لگے تو ان کے نتیجے میں آزاد نظم کا چلن بھی اردو میں عام ہوا۔ روایت کی پاسداری کرنے والوں نے اردو میں آزاد نظم کی قبولیت کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا لیکن، رفتہ رفتہ آزاد نظم نے ہماری ادبی تاریخ میں اپنی مستقل جگہ بنالی۔ ان دنوں نظمِ معرّا اور آزاد نظم کے ساتھ ساتھ نثری نظم بھی اردو میں عام ہوتی جارہی ہے۔

© NCERT not to be republished

علی حیدر نظمؔ طباطبائی

1853 تا 1933

نظمؔ طباطبائی لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں ہوئی۔ نظمؔ طباطبائی کی والدہ لکھنؤ کے نواب معتمدالدولہ آغا میر کے خاندان سے تھیں۔ اور آغا میر لکھنؤ کے نواب غازی الدین حیدر کے وزیرِ اعظم تھے۔ نظمؔ طباطبائی نواب واجد علی شاہ کی بیوی بوٹا بیگم کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ اِسی رشتہ کی وجہ سے وہ 1868 میں اپنے والد کے ساتھ مٹیا برج (کلکتہ) چلے گئے تھے۔ وہیں انھوں نے درسِ نظامی کی تعلیم مکمل کی۔ 1887 تک نظمؔ کلکتہ میں ہی مختلف ملازمتیں کرتے رہے لیکن 1887 میں تلاشِ معاش کے سلسلے میں حیدرآباد پہنچے اور پھر اخیر عمر تک وہیں رہے۔ حیدرآباد میں انھوں نے کئی ملازمتیں کیں۔ کتب خانہ آصفیہ کے مہتمم رہے۔ نظام کالج حیدرآباد میں پہلے عربی، فارسی کے لکچرر اور پھر اردو کے استاد کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ 1918 میں وہ دارالترجمہ حیدرآباد سے وابستہ ہو گئے اور پھر اخیر تک یہاں مختلف علمی اور ادبی خدمات انجام دیتے رہے۔ دارالتّرجمہ میں ملازمت کے دوران انھوں نے کئی کتابوں کے ترجمے کیے۔ یہاں سے شائع ہونے والی کتابوں پر نظرِ ثانی کی اور مختلف علوم کی اصطلاحات وضع کرنے میں بھی انھوں نے اہم حصّہ لیا۔ ان کا انتقال حیدرآباد میں ہوا۔

نظمؔ طباطبائی وسیع المطالعہ شخص تھے۔ انھیں اردو کے علاوہ عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں پر بھی پوری قدرت حاصل تھی۔ فلکیات اور علمِ عروض سے انھیں خصوصی دل چسپی تھی۔

اردو ادب میں نظمؔ طباطبائی دو وجہوں سے خاص طور پر مشہور ہیں اور ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ ایک تو یہ کہ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے 1901 میں دیوانِ غالبؔ کی مکمل شرح حیدرآباد سے شائع کی۔ اس شرح کا معیار اور علمی سطح خاصی بلند ہے۔ اس میں خالص علمی انداز میں غالبؔ کے اشعار کا تنقیدی محاکمہ پیش کیا گیا ہے اور محاسنِ شعر کو نمایاں کرنے کے ساتھ ساتھ کئی جگہ خامیوں کی بھی نشان دہی کی گئی ہے۔

نظمؔ کی شہرت کا دوسرا سبب ان کا منظوم ترجمہ ''گورِ غریباں'' ہے۔ انگریزی زبان کے شاعر تھامس گرے (Thomas Gray)

کی 32 بندوں پر مشتمل مشہور نظم نوحہ (Elegy written in a Country Church yard) کا منظوم ترجمہ نظم طباطبائی نے جس فنی اہتمام اور ہنرمندی سے کیا ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ اس منظوم ترجمے کا عنوان انھوں نے ''گورِغریباں'' رکھا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ترجمے میں اصل نظم کا سوز اور دردانگیزی کی کیفیت برقرار ہے۔ نظم طباطبائی نے اس ترجمے میں نظم کی ہیئت کا ایک نیا تجربہ کیا ہے۔ نظم کا ہر بند انگریزی اسٹینزا (Stanza) کی ہیئت میں لکھا گیا ہے۔ نظم طباطبائی نے قافیہ بندی کا نیا طرز اختیار کیا ہے۔

© NCERT not to be republished

5257CH23

گورِ غریباں

وداعِ روزِ روشن ہے گجر شامِ غریباں کا
چراگاہوں سے پلٹے قافلے وہ بے زبانوں کے
قدم گھر کی طرف کس شوق میں اُٹھتا ہے دہقاں کا
یہ ویرانہ ہے، میں ہوں، اور طائر آشیانوں کے

....

اندھیرا چھا گیا، دنیا نظر سے چھُپتی جاتی ہے
جدھر دیکھو اٹھا کر آنکھ اُدھر اک ہو کا ہے عالم
مگس لیکن کسی جا بھیر ویں بے وقت گاتی ہے
جرس کی دُور سے آواز آتی ہے کبھی پیہم

....

کبھی اک گنبدِ کہنہ پہ بُومِ خانماں ویراں
فلک کو دیکھ کر شکووں کا دفتر باز کرتا ہے
کہ دنیا سے الگ اک گوشۂ عزلت میں ہوں پنہاں
کوئی پھر کیوں قدم اس کنجِ تنہائی میں دھرتا ہے

....

نہ دیکھیں حال ان لوگوں کا ذلّت کی نگاہوں سے
بھرا ہے جن کے سر میں غرّہ توّابی و خانی
یہ ان کا کاسۂ سر کہہ رہا ہے کج کلاہوں سے
"عجب نادان ہیں وہ جن کو ہے عُجبِ تاجِ سلطانی"

© NCERT not to be republished

خدا جانے تھے ان لوگوں میں کیا کیا جوہرِ قابل؟
خدا معلوم رکھتے ہوں گے یہ ذہنِ رسا کیسے؟
خدا ہی کو خبر ہے کیسے کیسے ہونگے صاحب دل؟
خدا معلوم ہوں گے بازوے زور آزما کیسے؟

....

نہ دیکھ ان استخواں ہاے شکستہ کو حقارت سے
یہ ہے گورِ غریباں، اک نظر حسرت سے کرتا جا
نکلتا ہے یہ مطلب لوحِ تربت کی عبارت سے
''جو اس رستے گزرتا ہے تو ٹھنڈی سانس بھرتا جا''

....

حقیقت غور سے دیکھی جو ان سب مرنے والوں کی
تو ایسا ہی نظر آنے لگا انجامِ کار اپنا
انھی کی طرح جیسے مل گئے ہیں خاک میں ہم بھی
یونہی پرسانِ حال آ نکلا ہے اک دوستدار اپنا

....

یہ اُس سے ایک دہقانِ کہن سال آ کے کہتا ہے
کہ ہاں ہاں، خوب ہم واقف ہیں، دیکھا ہے اُسے اکثر
پھر اس کے بعد دل ہی دل میں کچھ غم کھا کے کہتا ہے
کہ اب تک پھرتا ہے آنکھوں میں پھرنا اس کا سبزے پر

....

"وہ اس کا نور کے تڑکے ادھر گلگشت کو آنا"
"وہ پو پھٹنے سے پہلے آ کے پھرنا سبزہ زاروں میں"
"وہ کچھ کم دن رہے اُس کا لبِ جو کی طرف جانا"
"وہ اس کا مسکرانا دیکھ کر شور آبشاروں میں"

....

غرض کیا کیا کہوں، اک روز کا یہ ذکر ہے صاحب!
"کہ اس میداں میں پھرتے صبح دم اس کو نہیں دیکھا"
"ہوا پھر دوسرا دن، اور نظر سے وہ رہا غائب"
"خیاباں میں اُسے پایا، نہ دریا پر کہیں دیکھا"

....

"پر اس کے تیسرے دن دیکھتا کیا ہوں جنازے کو"
"لیے آتے ہیں سب پڑھتے ہوئے کلمہ شہادت کا"
"تمھیں پڑھنا تو آتا ہوگا!" آؤ پاس سے دیکھو"
"یہ اس کی قبر ہے اور یہ کتابہ سنگِ تربت کا"

....

"خدا بخشے اسے بس دوست کا رہتا تھا وہ جویا"
"تو نکلا دوست اک آخر خداوندِ کریم اس کا"
"اب اس کے نیک و بد کا ذکر کرنا ہی نہیں اچھا"
"کہ روشن ہے خدا پر عالمِ امید و بیم اُس کا"

(نظم طباطبائی)

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی

گجر	:	گھنٹہ، گھڑیال
دہقاں	:	گاؤں میں رہنے والا، کسان
طائر	:	چڑیا، پرندہ
ہو	:	سنّاٹا
جرس	:	گھنٹی
مگس	:	مکّھی
کتابہ	:	سنگِ مزار پر لکھی ہوئی عبارت
پیہم	:	لگاتار، مسلسل
کہنہ	:	پرانا
بوم	:	اُلّو
خانماں	:	گھر
عزلت	:	تنہائی
پنہاں	:	پوشیدہ
استخواں	:	ہڈّی
گور	:	قبر
گل گشت	:	باغ کی سیر
خیاباں	:	چمن

© NCERT not to be republished

غور کرنے کی بات

- زندگی کا انجام موت ہے۔ امیر و غریب سب ہی اس کی زد میں ہیں۔ مرنے والے کے اچھے کام اور اس کی محبتیں یاد رہ جاتی ہیں۔

سوالات

1. 'گورِ غریباں' کے اشعار کس انگریزی نظم کا ترجمہ ہیں؟
2. زمین میں کیسے کیسے لوگ دفن ہیں؟
3. لوحِ تربت کسے کہتے ہیں؟
4. کہن سال دہقاں کیا کہتا ہے؟

عملی کام

- نظم کے کسی ایک بند کو زبانی یاد کیجیے۔

© NCERT not to be republished

اقبالؔ

1877 تا 1938

محمد اقبال پنجاب کے ایک مشہور شہر سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کے بزرگوں کا سلسلہ کشمیر سے ملتا ہے۔ ان کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا۔ اقبال نے ابتدائی تعلیم مولوی میر حسن سے حاصل کی۔ 1893 میں انٹرنس پاس کیا، 1897 میں لاہور کے گورنمنٹ کالج سے بی۔اے کیا۔ دو سال بعد 1899 میں ایم۔اے کیا۔ مزید تعلیم کے لیے 1905 میں یورپ گئے۔ وہاں ڈاکٹریٹ اور بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی۔ واپس آکر لاہور میں وکالت شروع کی۔ کچھ عرصے تک یہی ان کا ذریعۂ معاش رہا۔ انھوں نے مختلف اوقات میں برطانیہ، جرمنی، اسپین، فرانس، فلسطین، افغانستان وغیرہ کا سفر کیا۔ وہ سماجی اور سیاسی سرگرمیوں میں بھی حصّہ لیتے رہے۔ اِنھی سرگرمیوں نے ان کی شاعری میں بڑا تنوّع پیدا کیا۔ شاعری کی بدولت ان کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ لاہور میں ان کا انتقال ہوا۔

اقبالؔ، اردو کے سب سے بڑے فلسفی شاعر ہیں۔ ان کا مشرقی اور مغربی فکر کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ قدیم اور جدید علوم پر وہ گہری نظر رکھتے تھے۔ انھوں نے 20 ویں صدی کے ذہنی، معاشرتی اور اخلاقی مسائل کا جائزہ انتہائی بالغ نظری کے ساتھ لیا ہے۔ اقبالؔ کی فکر کے بہت سے پہلو آج کی تہذیب کو سمجھنے میں معاون ہوتے ہیں۔ خودی، عمل، عشق، زمان ومکاں اور انسانی جبر واختیار کے موضوع پر اقبالؔ کے اشعار ہماری اجتماعی فکر کا حصّہ بن چکے ہیں۔ وہ جتنے بڑے مفکر تھے اتنے ہی بڑے فنکار بھی تھے۔ فارسی، انگریزی اور اردو میں اقبالؔ کی نظم ونثر کا ذخیرہ بکھرا ہوا ہے۔ ان کی اردو شاعری کے مجموعے یہ ہیں:

''بانگِ درا''، ''بالِ جبریل''، ''ضَربِ کلیم'' اور ''ارمغانِ حجاز''! یہ نظم ''روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے''، ''بالِ جبریل'' سے لی گئی ہے۔

© NCERT not to be republished

5257CH24

روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ
ایّامِ جدائی کے ستم دیکھ، جفا دیکھ
بے تاب نہ ہو، معرکۂ بیم و رجا دیکھ

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل، یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک، یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایّام میں آج اپنی ادا دیکھ

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دُور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحرِ تخیّل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیر خودی کر، اثرِ آہِ رسا دیکھ

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں
جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنّت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں
اے پیکرِ گِل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

نالندہ ترے عود کا ہر تار ازل سے
تو جنسِ محبت کا خریدار ازل سے
تو پیرِ صنم خانۂ اسرار ازل سے
محنت کش و خوں ریز و کم آزار ازل سے
ہے راکبِ تقدیرِ جہاں تیری رضا دیکھ

(اقبال)

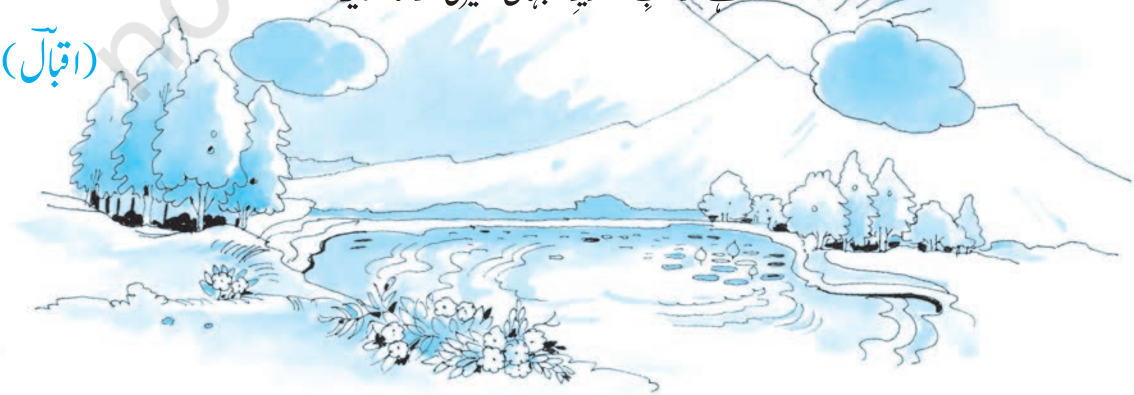

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی

معرکہ	:	جنگ
بیم	:	خوف، اندیشہ
رجا	:	امید
تصرّف	:	اختیار، قابو
ضو	:	روشنی، نور
شرر	:	چنگاری
پیہم	:	لگاتار، مسلسل
نالندہ	:	(رونے والا) رنج ونشاط کے نغمے سنانے والا
عود	:	ایک ساز جو سارنگی سے کسی قدر ملتا ہے
خوں ریز	:	خون بہانے والا
کم آزار	:	تکلیف نہ دینے والا
راکب	:	سواری

غور کرنے کی بات

- غور کرنے کی بات یہ ہے کہ پوری کائنات میں سب سے بہتر تخلیق انسان کی ہے۔ باقی تمام چیزیں اسی کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ اس حقیقت کو سمجھنے کے بعد پھر انسان کو اپنے منصب کا شعور بھی حاصل کرنا چاہیے۔
- اقبالؔ نے اس نظم میں بڑی خوب صورتی کے ساتھ آدم کے جنت سے زمین پر بھیجے جانے کا قصہ بیان کیا ہے، آدم کی آمد پر زمین کی روح بڑی گرم جوشی سے ان کا استقبال کرتی ہے۔ آدم کو ان کی حقیقت بتاتی ہے کہ تم ذرا غور سے اپنے وجود پر نظر

© NCERT not to be republished

ڈالو۔ کائنات کی ہر شے صرف تمھارے لیے تخلیق کی گئی ہے۔ یہ سب تمھارے ہی محکوم ہیں۔ فرشتوں نے آدم کو ان کی عظمت کا احساس دلاتے ہوئے جنت سے رخصت کیا تھا۔ پھر دنیا میں اسی طرح ان کا شان دار اور پر تپاک استقبال بھی کیا جانا چاہیے تھا۔ نظم میں ارتقائے خیال کے ساتھ الفاظ کا انتخاب اور آہنگ بھی بہت مناسب ہے۔

سوالات

1. روحِ ارضی آدم کا استقبال کیوں کرتی ہے؟
2. تعمیرِ خودی کا کیا مطلب ہے؟
3. اس نظم کا بنیادی خیال کیا ہے؟
4. اقبالؔ کی شاعری کا امتیاز کیا ہے؟
5. ایسی نظم جس کے ہر بند میں پانچ مصرعے ہوں، اُسے کیا کہتے ہیں؟

عملی کام

- متضاد لکھیے

ارضی فلک خورشید ازل محبت

- اس نظم کے پانچ مرکب الفاظ کی نشان دہی کیجیے۔

© NCERT not to be republished

جمیلؔ مظہری

1904 تا 1980

جمیلؔ مظہری عظیم آباد (پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسۂ سلیمانیہ، پٹنہ میں حاصل کی۔ بعد میں کلکتے چلے گئے۔ وہاں ایم۔اے تک کی تعلیم حاصل کی۔ ابتدا میں اردو اخبارات میں کالم لکھتے رہے۔1950 سے 1974 تک شعبۂ اردو، پٹنہ کالج اور پٹنہ یونیورسٹی سے بہ حیثیت استاد منسلک رہے۔ان کا انتقال مظفر پور میں ہوا۔ 1974 میں انھیں غالبؔ ایوارڈ برائے اردو شاعری عطا کیا گیا۔''نقشِ جمیل''، ''فکرِ جمیل''، ''عرفانِ جمیل''، ''آثارِ جمیل'' کے علاوہ ''جمیلؔ مظہری کے مرثیے'' اور'' مثنوی آب وسراب''، ان کی شعری کتابیں ہیں۔'' شکست وفتح'' (ناولٹ) اور'' منثوراتِ جمیل مظہری'' ان کی نثری کتابیں ہیں۔ جمیلؔ مظہری نے اقبالؔ کے زیر اثر شاعری شروع کی اور بعد میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے۔

© NCERT not to be republished

5257CH25

ارتقا

ہر حال میں مشیّت مُجھ کو بنا رہی ہے　　میں اُس کی قدرتوں کا شہکار بن رہا ہوں
خود اپنی جنتوں کی تخلیق کررہا ہوں　　خود اپنی زندگی کا معمار بن رہا ہوں
یہ جبر و قدر کی اک منزل ہے درمیانی　　مجبور تو ہوں لیکن مختار بن رہا ہوں

یہ راہ وہ ہے جس میں ہر سانس اک سفر ہے
منزل بھی راستہ ہے لغزش بھی راہبر ہے

حکمت کی رہبری میں پرواز کی امنگیں　　امکاں کے دائروں کو پھیلا کے بڑھ رہی ہیں
وہ قوتیں جو اب تک تحتِ شعور میں تھیں　　گہوارۂ خودی میں پروان چڑھ رہی ہیں
انجام کی بصیرت خواہش پہ حکمراں ہے　　آزادیاں خود اپنی زنجیر گڑھ رہی ہیں

پکڑے ہوئے ہیں دامن گو خیر و شر ہمارا
پابندیوں میں بھی ہے جاری سفر ہمارا

جذبات رفتہ رفتہ افکار بن رہے ہیں　　افکار کا نتیجہ کردار بن رہا ہے
ہمدردیوں کی شدّت انصاف بن رہی ہے　　پروردگی کا جذبہ ایثار بن رہا ہے
لغزش سے تجربہ ہے اور تجربے سے حکمت　　تحقیق ہو رہی ہے معیار بن رہا ہے

گمراہیوں سے ہوکر ہے راستہ ہمارا
تاریخ بن رہا ہے ہر نقشِ پا ہمارا

(جمیلؔ مظہری)

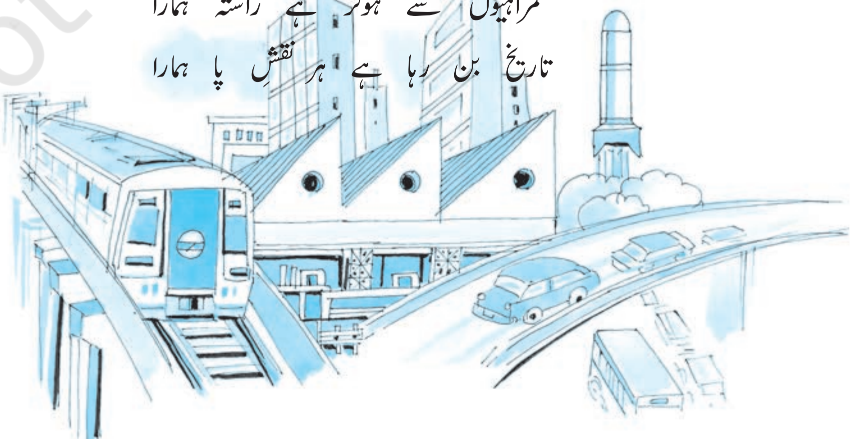

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی

ارتقا	:	تدریجی ترقی، سلسلے وار ترقی
مشیّت	:	اللہ کی مرضی
قدرت	:	غیبی طاقت
شہکار	:	بہترین کارنامہ، شاہ کار
تخلیق	:	پیدا کرنا، بنانا، وضع کرنا، فن پارہ
معمار	:	بنانے والا
جبر	:	انسان کا مجبور ہونا
قدر	:	انسان کا با اختیار ہونا، مختاری
حکمت	:	عقل، دانائی
رہبری	:	رہنمائی، راہ دکھانا
تحتِ شعور میں	:	شعور کی سطح سے نیچے
گہوارہ	:	پالنا، جھولا
خودی	:	اپنے وجود کا احساس
بصیرت	:	شعور، سوجھ بوجھ
خیر و شر	:	اچھّائی اور برائی
افکار	:	فکر کی جمع، خیالات، تصورات
پروردگی	:	پرورش کرنا
ایثار	:	قربانی

© NCERT not to be republished

گمراہی	:	غلطی، راستے سے بھٹک جانا
نقشِ پا	:	پاؤں کے نشان

غور کرنے کی بات

- اس نظم کا مزاج فلسفیانہ ہے۔ دنیا میں انسان کے اختیار میں کون کون سی چیزیں ہیں اور وہ کس طرح اپنی کامیابی کی نئی نئی منزلیں تلاش کرتا ہے، اسی بات کو شاعر نے نظم میں بیان کیا ہے۔
- انسان اپنے ارتقا کے سفر میں اچھے برے ہر طرح کے تجربوں سے گزرتا ہے۔ کبھی ناکام ہوتا ہے کبھی کامیاب ہوتا ہے۔ لیکن اسے نہ تو ہمت ہارنا چاہیے نہ اپنے سفر سے منہ موڑنا چاہیے۔ شاعر نے نظم میں یہی پیغام دیا ہے اور بتایا ہے کہ کامرانی کی منزل ہمارا انتظار کررہی ہے۔
- نظم میں بعض اصطلاحیں بھی استعمال ہوئی ہیں۔ جیسے۔ مشیّت، جبر وقدر، حکمت، امکان، تحتِ شعور، گہوارۂ خودی، خیر وشر آپ اپنے استاد کی مدد سے اِن اصطلاحوں کا مفہوم سمجھیے۔

سوالات

1. شاعر نے انسان کی ترقی کے سلسلے میں کن رکاوٹوں کا ذکر کیا ہے؟ بتائیے۔
2. ''لغزش سے تجربہ ہے اور تجربے سے حکمت'' شاعر اس مصرعے میں کیا کہنا چاہتا ہے، لکھیے۔
3. انسان نے اس کائنات کو اپنی کوششوں سے کس طرح خوش رنگ اور کارآمد بنایا ہے؟
4. ''خود اپنی زندگی کا معمار بن رہا ہوں'' اس مصرعے کا مطلب کیا ہے؟

عملی کام

- انسانی ارتقا اور تہذیب کی ترقی کے موضوع پر ایک مضمون لکھیے۔

© NCERT not to be republished

ن۔م۔راشدؔ

1910 تا 1975

راشدؔ کا نام نذر محمد تھا۔ وہ گجرانوالہ کے رہنے والے تھے۔ اپنی جوانی کے دور میں وہ کچھ عرصے تک خاکسار تحریک سے بھی متاثر رہے۔ مشرق پر مغرب کی بالادستی اور مغرب کے ہاتھوں مشرق کے سیاسی استحصال کے خلاف راشدؔ نے کھل کر آواز بلند کی۔ اپنی عملی زندگی کے آغاز میں راشدؔ کچھ دنوں تک آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ رہے۔ زندگی کا خاصا بڑا حصّہ ملازمت کے سلسلے میں انھوں نے ایران میں اور پھر یو۔ این۔ او میں گزارا۔ ان کا پہلا مجموعہ ''ماورا'' اردو شاعری میں ایک نئے طرزِ احساس اور اظہار کا ترجمان ہے۔ ''ماورا'' کے بعد راشدؔ کے جو شعری مجموعے شائع ہوئے، ان کے نام اس طرح ہیں: ''ایران میں اجنبی''، ''لا=انسان'' اور ''گماں کا ممکن'' ان کا کلّیات بھی شائع ہو چکا ہے۔ نثر میں ان کی کتاب ''جدید فارسی شاعری'' مشہور ہے۔

راشدؔ کی شاعری کا سب سے بڑا امتیاز ان کی دانشورانہ حسّیت ہے۔ اقبالؔ کے بعد اپنی شاعری کے وسیلے سے راشدؔ نے مشرق کی فکر اور دانشورانہ روایت کو ایک نئی جہت دی ہے۔ ''ماورا'' کی اشاعت کے دور میں راشدؔ اور میرا جیؔ کی نظموں کو مبہم اور لایعنی بھی کہا گیا۔ لیکن جیسے جیسے شاعری کا مذاق بدلتا گیا، راشدؔ اور میرا جیؔ کے شعری محاسن اور ان کی ادبی خدمات کا اعتراف بھی عام ہوتا گیا۔ راشدؔ کا شمار بیسویں صدی کے اہم ترین شاعروں میں ہوتا ہے۔

5257CH26

زندگی سے ڈرتے ہو؟

زندگی سے ڈرتے ہو؟
زندگی تو تم بھی ہو، زندگی تو ہم بھی ہیں!
آدمی سے ڈرتے ہو؟
آدمی تو تم بھی ہو، آدمی تو ہم بھی ہیں!

آدمی زباں بھی ہے، آدمی بیاں بھی ہے
اس سے تم نہیں ڈرتے!
حرف اور معنی کے رشتہ ہائے آہن سے، آدمی ہے وابستہ
آدمی کے دامن سے زندگی ہے وابستہ
اس سے تم نہیں ڈرتے!
''اَن کہی'' سے ڈرتے ہو!
جو ابھی نہیں آئی، اُس گھڑی سے ڈرتے ہو
اُس گھڑی کی آمد کی آگہی سے ڈرتے ہو!

پہلے بھی تو گزرے ہیں،
دورِ نارسائی کے ''بے ریا'' خدائی کے
پھر بھی یہ سمجھتے ہو، ہیچ آرزو مندی
یہ شبِ زباں بندی، ہے رہِ خداوندی!
تم مگر یہ کیا جانو،

© NCERT not to be republished

لب اگر نہیں ہلتے، ہاتھ جاگ اٹھتے ہیں
ہاتھ جاگ اٹھتے ہیں، راہ کا نشاں بن کر
نور کی زباں بن کر
ہاتھ بول اٹھتے ہیں، صبح کی اذاں بن کر
روشنی سے ڈرتے ہو؟
روشنی تو تم بھی ہو، روشنی تو ہم بھی ہیں،
روشنی سے ڈرتے ہو؟

شہر کی فصیلوں پر
دیو کا جو سایہ تھا پاک ہو گیا آخر
رات کا لبادہ بھی
چاک ہو گیا آخر، خاک ہو گیا آخر
اژدہامِ انساں سے فرد کی نوا آئی
ذات کی صدا آئی
راہِ شوق میں جیسے راہرو کا خوں لپکے
اک نیا جنوں لپکے!
آدمی چھلک اٹھے
آدمی ہنسے دیکھو، شہر پھر بسے دیکھو
تم ابھی سے ڈرتے ہو؟
ہاں ابھی تو تم بھی ہو، ہاں ابھی تو ہم بھی ہیں،
تم ابھی سے ڈرتے ہو!

(ن - م - راشدؔ)

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی

رشتہ ہائے آہن	:	آہنی رشتے، مضبوط تعلق
وابستہ	:	متعلق، جڑا ہوا
آگہی	:	آگاہی، علم
نارسائی	:	نہ پہنچ پانا، ناکامی
بے ریا	:	نمود و نمائش سے پاک
ہیچ	:	بے معنی، بے حقیقت، لاحاصل
آرزومندی	:	دل میں نئی نئی تمناؤں کا پیدا ہونا، امیدیں باندھنا
زباں بندی	:	زبان بند کردیا جانا
فصیل	:	دیوار، چہار دیواری
لبادہ	:	لباس، کپڑا

غور کرنے کی بات

- اس نظم میں شاعر نے یہ بتایا ہے کہ انسان اس کائنات میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے اپنی ذمّے داریوں کو سمجھنا چاہیے اور زندگی کے سلسلے کو آگے بڑھاتے رہنا چاہیے۔ زندگی ایک مستقل امکان کا نام ہے۔

© NCERT not to be republished

سوالات

1. اس نظم میں شاعر کیا کہنا چاہتا ہے؟
2. ''جو ابھی نہیں آئی اس گھڑی سے ڈرتے ہو'' شاعر نے یہ کیوں کہا ہے؟
3. ''آدمی کے دامن سے زندگی ہے وابستہ'' اس کا مطلب کیا ہے؟

عملی کام

- اس نظم سے آپ تین تراکیب منتخب کیجیے۔
- اس نظم کے چند ہم قافیہ الفاظ کو جمع کیجیے۔
- اس نظم سے چند ایسے مصرعوں کو یکجا کیجیے جن میں ردیفوں کا استعمال ہوا ہو۔

© NCERT not to be republished

عمیق حنفی

1928 تا 1988

عمیق حنفی مہو چھاؤنی ضلع اندور (مدھیہ پردیش) میں پیدا ہوئے۔اُن کا پورا نام عبدالعزیز حنفی تھا۔عمیق حنفی کی ابتدائی تعلیم مہو میں ہوئی۔اعلیٰ تعلیم کے لیے انھوں نے اندور کی راہ لی۔سیاسیات اور تاریخ میں ایم۔اے کیا۔فلسفے سے انھیں خاص دل چسپی تھی۔ ان کے فکر وفن پر ان علوم کا اثر آخر تک قائم رہا۔طویل مدت تک آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت کی۔ اسٹیشن ڈائریکٹر کی حیثیت سے 1987 میں سبکدوش ہوئے۔ان کا انتقال دلی میں ہوا۔

عمیق حنفی موسیقی کے بھی بڑے دلدادہ تھے۔انھوں نے باقاعدگی سے موسیقی کا علم حاصل کیا تھا۔موسیقی کے فن کی باریکیوں پر انھوں نے بعض بہت عمدہ مضامین لکھے ہیں۔اردو کے علاوہ انگریزی اور دیگر ہندوستانی زبانوں کے ادب پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔''شعلے کی شناخت'' اور ''شعر چیزے دیگراست'' ان کی تنقیدی کتابیں ہیں۔

عمیق حنفی نے اپنا ادبی سفر ترقی پسند تحریک کے عروج کے دور سے شروع کیا۔ان کا پہلا مجموعۂ کلام ''سنگ پیراہن'' اسی دور سے تعلق رکھتا ہے۔اس کے بعد وہ جدیدیت کے زیر اثر آگئے۔کئی شعری تجربے کیے۔متعدد طویل نظمیں بھی لکھیں، جنھیں غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ان میں ''سندباد''، ''شہرزاد''، ''سیارگاں''، ''شب گشت''، ''صوت الناقوس'' اور ''صلصلۃ الجرس'' کی خاص اہمیت ہے۔'' آئینے کا کورس'' ان کے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ ہے۔

© NCERT not to be republished

ملکِ بے سحر و شام

5257CH27

کچھ برس پہلے سویرے منھ اندھیرے
اک پہاڑی پر پہنچ جاتے تھے ہم
ایک کالے سخت تکیے سے اٹھا کر اپنا سر
ادھ جگا سورج ابھر کر دیکھ لیتا تھا ہمیں!
ہم سحر خیزوں سے شرما کر جھکا لیتا تھا سر
دفعتاً اس کے لبوں سے پھوٹ پڑتی تھی ہنسی
ہاتھ وہ ہم سے ملاتا تھا بہ صد حسنِ تپاک
جسم و جاں میں پھیل جاتی تھی شگفتہ تازگی

شام کو جب جھیل کے پانی میں ڈالے اپنے پانو
دائرہ در دائرہ موجیں اٹھا دیتے تھے ہم
تب تھکا ماندہ، انیندا، مضمحل سورج
اپنے خوابستان میں رو پوش ہو جانے سے قبل
مسکرا کر ہم سے کہتا شب بخیر
اور چل پڑتے تھے ہم سب اپنے گھر
اپنے دل کی دائرہ در دائرہ موجوں میں سورج گھیر کر

© NCERT not to be republished

اور اب؟

اب تو یہ بھی یاد رکھنا ہے محال

کس طرف پورب ہے، پچھّم ہے کدھر،

کب اگا کرتا ہے سورج اور کب جاتا ہے ڈوب!

کس کو بستر میں پتہ!

کس کو دفتر میں خبر!

(عمیؔق حنفی)

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی

تپاک	:	گرم جوشی
بہ صد حسنِ تپاک	:	بے حد گرم جوشی کے ساتھ
انیندا	:	ادھ جگا
مُضمحل	:	نڈھال
خوابستان	:	خوابوں کی سرزمین
روپوش	:	غائب
محال	:	مشکل

غور کرنے کی بات

- سب سے پہلے اس نظم کے عنوان پر توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ شاعر نے اپنے عہد کے ماحول کو سامنے رکھ کر یہ عنوان قائم کیا ہے۔ یعنی نئے زمانے کی ضرورتوں اور تقاضوں نے ہمیں ایسی کئی چیزوں سے محروم کر دیا ہے جن سے ہم روحانی مسرت حاصل کرتے تھے۔ ہم اپنی ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے کے لیے اس قدر مصروف رہتے ہیں کہ ہمیں یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ صبح سویرے کب سورج طلوع ہوتا ہے اور کس لمحے وہ ڈوب جاتا ہے۔ گویا اب ہم ایک ایسے ملک کے باسی ہوکر رہ گئے ہیں جس کی کوئی صبح ہوتی ہے نہ شام۔ شاعر نے اصل میں فطرت سے دوری کے المیے کو موضوع بنایا ہے۔ وہ بڑی حسرت سے ماضی کے اُن دنوں کو یاد کرتا ہے جب صبح سویرے اُٹھ کر وہ تازہ دم سورج کے طلوع ہونے کا خوبصورت منظر دیکھا کرتا تھا۔ سورج اس کا بڑی گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم کرتا تھا۔ آناً فاناً اس کے جسم و جاں میں وہ ایک نئی روح پھونک دیتا تھا۔ اس کے بعد شاعر اس نظم کے آخری حصے میں گذشتہ شاموں کا ذکر کرتا ہے۔ اسے وہ جھیل کے پانی میں پانو ڈال کر بیٹھنا اور غروب ہونے سے قبل سورج کا شب بخیر کہنا یاد آتا ہے۔

سوالات

1. شاعر اپنے ماضی کی صبحوں کو کس لیے یاد کرتا ہے؟
2. شاعر کو اپنی گذشتہ شامیں کیوں یاد آتی ہیں؟
3. شاعر کے لیے کیا یاد رکھنا محال ہے؟

عملی کام

- ''صلصلۃ الجرس'' عمیق حنفی کی مشہور نعتیہ نظم ہے اسے تلاش کرکے پڑھیے۔

© NCERT not to be republished

شفیق فاطمہ شعریٰؔ

1930

شفیق فاطمہ شعریٰؔ کی پیدائش ناگپور میں 1930 میں ہوئی۔ عربی اور فارسی کی ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ بی۔اے کا امتحان عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد اور ایم۔اے کا امتحان ناگپور یونیورسٹی سے پاس کیا۔ شعریٰؔ نے ممتاز کالج حیدرآباد میں اردو کی استاد کی حیثیت سے ملازمت کا آغاز کیا اور یہیں سے سبکدوش ہوئیں۔ اس وقت ان کا قیام حیدرآباد میں ہے۔

شعریٰؔ کا پہلا مجموعہ ''آفاقِ نوا'' حیدرآباد سے دسمبر 1987 میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں صرف نظمیں ہیں ۔ دوسرا مجموعہ ''گلۂ صفورہ'' کے نام سے مکتبہ جامعہ، نئی دہلی سے نومبر 1990 میں شائع ہوا۔ یہ مجموعہ بھی ایک غزل اور چند قطعات کے علاوہ نظموں پر مشتمل ہے۔ ''سلسلۂ مکالمات'' کے نام سے شعریٰ کا کلیات 2006 میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا ہے۔

شعریٰؔ بنیادی طور پر نظم کی شاعرہ ہیں۔ ان کی نظموں کا اسلوب اور مرکزی خیال اتنا منفرد ہوتا ہے کہ کبھی کبھی نظم بہت پیچیدہ معلوم ہوتی ہے اور نظم کا مفہوم پوری طرح گرفت میں نہیں آتا۔ اکثر نظموں میں شعریٰؔ نے اسلامی تاریخ اور قرآنی واقعات سے بھی مدد لی ہے۔ انھوں نے موجودہ زمانے کے تہذیبی اور سیاسی مسائل کو جس انداز سے نظموں کا موضوع بنایا ہے، اس سے بھی ان کا منفرد اسلوب نمایاں ہوتا ہے۔

''یادنگر'' ایک نمائندہ نظم ہے اس نظم کا آہنگ اور اس کا مخصوص نغمہ قاری کو متوجہ کرتا ہے۔ اس نظم میں وطن سے دوری یا جلاوطنی کے احساس کو بہت خوبی سے نظم کیا گیا ہے۔

© NCERT not to be republished

یادنگر

میں اوس بن کے برس جاؤں تیرے سبزے پر
میں گیت بن کے تری وادیوں میں کھو جاؤں
بس ایک بار بلالے مجھے وطن میرے
کہ تیری خاک کے دامن میں چھپ کے سو جاؤں

شگفتہ گھاس میں یہ زرد زرد ننھے پھول
نہ جانے کس لیے پگڈنڈیوں کو تکتے ہیں
انھیں خبر ہی نہیں ان کو چننے والے آج
گھروں سے دور کسی کیمپ میں سسکتے ہیں

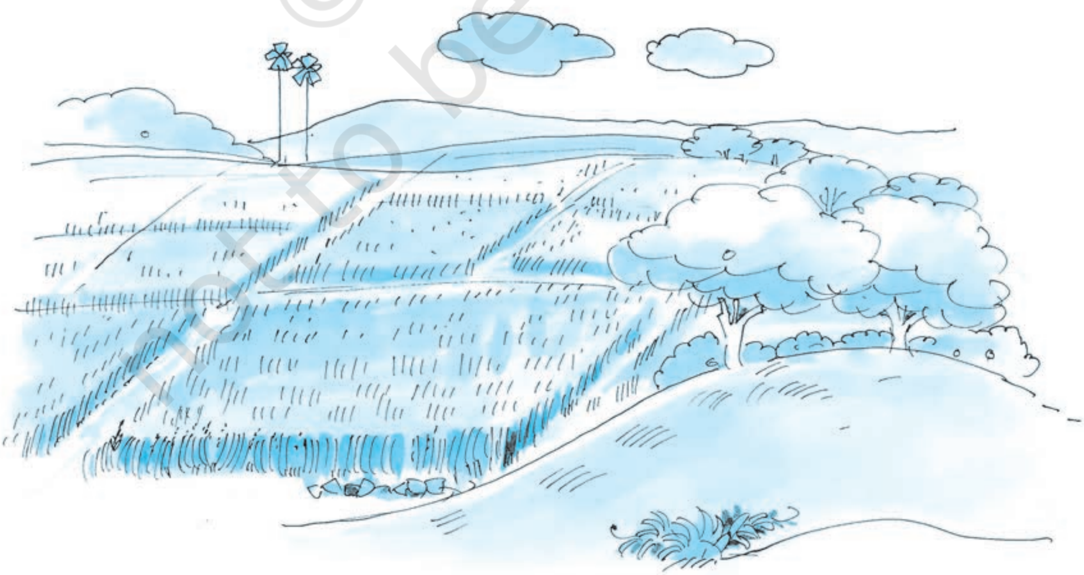

© NCERT not to be republished

5257CH28

کئی گھرانوں کی فریاد اس میں ڈوب گئی
اب اس کنوئیں پہ نہ آئے گی کوئی پنہاری
کسان کھیت نہ سینچیں گے ایسے پانی سے
ہری نہ ہوگی اسے پی کے کوئی پھُلواری

یہیں ندی کے کنارے اسے دبایا تھا
مگر شبانوں کو وہ بارہا نظر آئی
ہٹی جو ریت تو چمکا وہ چاند سا ماتھا
چلی ہوا تو وہ ریشم سی زلف لہرائی

میں تیرے پانو پڑوں، ہاتھ روک لے قاتل
اسے نہ مار جو تیری طرف ہمکتا ہے
یہ تیغ کو بھی کھلونا سمجھنے والا ہے
یہ لعل پھینک کے انگارہ چوس سکتا ہے

کہا کسی نے کہ وہ جلد لوٹ آئیں گے
کہا کسی نے کہ امید اب بہت کم ہے
الٰہی ڈوبتے دل کو ذرا سہارا دے
مرے چراغ کی لو آج کتنی مدّھم ہے

© NCERT not to be republished

نبولی نیم کی پکّی، اب آئے گا ساون
مگر یہ گیت اسے آہ کیسے یاد آیا
وہ اپنی ماں سے لپٹ کر نہ رو سکے گی کبھی
نہ سر پہ ہاتھ کبھی رکھ سکے گا ماں جایا

سُنا ہے نیند میں وہ چونک پڑتے ہیں
لہو کے داغ تھے جن پر، وہ ہاتھ جلتے ہیں
پڑوسیوں سے یہ کہہ دو وہ مشعلیں رکھ دیں
کہ ایک گانو کے گھر ساتھ ساتھ جلتے ہیں

الٰہی شام اب اس گانو میں نہ آنے پائے
کہ اس کے آتے ہی دکھیائیں مل کے روتی ہیں
درندے اپنے بھٹوں میں دہلنے لگتے ہیں
ہوائیں کوہ سے ٹکرا کے جان کھوتی ہیں

© NCERT not to be republished

دیے کے واسطے ننّھے پناہ گیر نہ رو
فلک پہ دیکھ وہ قندیلِ ماہ روشن ہے
اسی فضا میں مرے چاند تو بھی اُبھرے گا
جو تو ہے ساتھ تو غربت کی راہ روشن ہے

طلائی گھاس سے وادی میں تھا تلاطم سا
ہوا میں نرم شعاعوں کی سرسراہٹ تھی
نیا تھا چشمۂ مہر اور نیا تھا رنگِ سپہر
ہر ایک گوشہ میں لیکن اجل کی آہٹ تھی

ہوا نے دیپ بجھایا ہی تھا کہ نکلا چاند
قلم کو تیز چلاؤ کہ یہ بھی ڈوب نہ جائے
خود اپنے دل کے اجالے کا اعتبار نہیں
کہ ایک بار یہ جائے تو پھر پلٹ کے نہ آئے

یہ چاندنی کا اُجالا، یہ نیم شب کا سکوں
سفید گنبد و در دودھ میں نہائے ہوئے
ستارو! کوئی کہانی کہو کہ رات کٹے
نہ یاد آئیں مجھے روز و شب بھلائے ہوئے

(شفیق فاطمہ شعریٰ)

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی

شبانوں	:	شبان کی جمع، چرواہے
ماں جایا	:	بھائی
دکھیائیں	:	غم زدہ عورتیں
قندیل	:	چراغ، لالٹین
غُربت	:	پردیس
طلائی	:	سنہری
تلاطم	:	طوفان
شعاع	:	کرن
مہر	:	سورج
سپہر	:	آسمان
نیم شب	:	آدھی رات
پناہ گیر	:	پناہ لینے والا

غور کرنے کی بات

- نظم میں قتل و غارت گری کے الفاظ نظم کے مرکزی خیال کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔
- شاعرہ وطن سے دور جا کر وطن سے متعلق چیزوں کو یاد کرتی ہے۔
- نظم کی فضا غم انگیز اور دردناک ہے۔

© NCERT not to be republished

سوالات

.1 نظم کا مرکزی خیال کیا ہے؟

.2 نظم کا عنوان ''یادنگر'' نظم کے لیے کتنا موزوں ہے؟

.3 ''الٰہی شام اب اس گانو میں نہ آنے پائے'' اس بند میں نظم کا کردار شام سے کیوں خوف زدہ معلوم ہوتا ہے؟

.4 نظم کے آخری مصرعے میں نظم کا کردار'' بھلائے ہوئے روز وشب'' کو کیوں نہیں یاد کرنا چاہتا؟

عملی کام

- اپنی پسند کے تین بند یاد کر کے اُستاد کو سنائیے۔
- نظم کے چوتھے اور پانچویں بند کی تشریح کیجیے۔

© NCERT not to be republished

طویل نظم

اردو میں مثنوی، قصیدہ اور مرثیہ بھی طویل نظمیں کہی جاسکتی ہیں۔ لیکن طویل نظم دراصل نظم کی ایک خاص قسم ہے جس کا چلن پہلی جنگ عظیم (1914) کے بعد عام ہوا۔ پہلی مشہور ترین طویل نظم انگریزی کے ممتاز شاعر ٹی ایس ایلیٹ کی The Wasteland ہے۔ شاعری کے بعض نقادوں کا خیال ہے کہ طویل نظم ایک طرح کا تخلیقی مقالہ ہوتا ہے ۔ اپنی وسعت اور طوالت کے باعث طویل نظم میں یہ گنجائش رہتی ہے کہ شعری تجربے کا اظہار تسلسل کے ساتھ اور مربوط طریقے سے کیا جائے۔ طویل نظم کی ہئیت متعین نہیں ہے۔ یہ نظم عام طور پر ابتدا سے اختتام تک ایک ہی بحر میں کہی جاتی ہے۔ لیکن یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مختلف بحروں کو ایک ہی نظم میں استعمال کیا جائے۔

ظاہری اعتبار سے طویل نظم کی ایک معروف مثال ''مسدّسِ حالؔی'' ہے اور اقبالؔ کی بعض نظمیں ''خضرِراہ''، ''مسجدِ قرطبہ''، ''ذوق وشوق'' بھی طویل نظمیں ہیں۔ ان نظموں کی ہئیت روایتی ہے۔ طویل نظم کی ہئیت میں بڑے اور انقلابی تجربوں کا سلسلہ سردار جعفری کی نظموں سے شروع ہوا۔ ''نئی دنیا کو سلام'' اور ''ایشیا جاگ اٹھا'' ان کی مشہور طویل نظمیں ہیں۔ اردو کی مشہور طویل نظمیں جنھیں بہت مقبولیت ملی، یہ ہیں: حسنِ کوزہ گر (ن م راشدؔ)، ٹھٹھ (جعفر طاہر)، پرچھائیاں (ساحؔر لدھیانوی)، آدھی صدی کے بعد (وزیر آغا)، سند باد، شہرزاد، شب گشت، صلصلۃ الجرس، سیارگاں، صوت الناقوس (عمیق حنفی)، ولاس یاترا (کمار پاشی)۔ مشرق ومغرب کی تقریباً تمام زبانوں میں طویل نظمیں لکھی جارہی ہیں۔

© NCERT not to be republished

علی سردارؔ جعفری

1913 تا 2000

علی سردار جعفری بلرام پور (اتّر پردیش) میں پیدا ہوئے۔ لکھنؤ، دہلی اور علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کی عمر 23/ 24 سال رہی ہوگی جب اردو میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ یہ ابتدا ہی سے اس تحریک میں شامل ہوگئے۔ لکھنؤ میں سبطِ حسن اور مجاؔز کے ساتھ مل کر انھوں نے ''نیا ادب'' کے نام سے ایک رسالہ نکالا۔ بعد میں وہ بمبئ چلے گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ انتقال بمبئ میں ہوا۔

سردار جعفری شاعر بھی ہیں اور نقاد بھی ''خون کی لکیر''، ''ایشیا جاگ اٹھا'' ان کے ابتدائی شعری مجموعے ہیں۔ بعد کے مجموعوں میں ''ایک خواب اور''، ''پیراہنِ شرر'' اور ''لہو پکارتا ہے'' قابلِ ذکر ہیں۔

سردار جعفری کا شمار ترقی پسند فکر کے نمائندہ ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ان کی تصنیف ''ترقی پسند ادب'' اس تحریک سے متعلق ایک اہم کتاب ہے۔ انھوں نے ''گفتگو'' کے نام سے ایک رسالہ بھی نکالا۔ کبیؔر، میرؔ اور غالبؔ سے انھیں بہت دل چسپی تھی۔ انھوں نے ان تینوں کا کلام اردو اور دیوناگری رسم خط میں اپنے تعارفی مقدموں کے ساتھ شائع کیا ہے۔

سردار جعفری کی شعری تخلیقات میں ''نئی دنیا کو سلام'' ایک طویل نظم ہے۔ سردار نے یہ نظم ہندوستان کی آزادی سے ایک سال پہلے 1946 میں لکھی تھی۔ نظم کا بنیادی موضوع مغربی سامراج اور سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت ہے۔ جدو جہد اور انقلاب کی دعوت کے بعد نظم ایک خوشگوار مستقبل کی امید پر ختم ہوتی ہے۔ نظم کا انداز تمثیلی ہے۔

© NCERT not to be republished

5257CH29

وقت کا ترانہ

تو نے لاکھوں بہاریں دیکھی ہیں
اب کی اس ملک کی بہار ہے اور
وادیاں گونجتی ہیں نعروں سے
ساز و آہنگِ آبشار ہے اور

قافلہ انقلاب کا ہے رواں
بج رہی ہے خوشی کی شہنائی
زلزلوں سے دہل رہی ہے زمیں
لے رہے ہیں پہاڑ انگڑائی

سُلگ اُٹھی ہے انتقام کی آگ
برف کی چوٹیاں دہکتی ہیں
ظلم اور جبر کے اندھیرے میں
سیکڑوں بجلیاں چمکتی ہیں

© NCERT not to be republished

جن کو کچلا گیا ہے صدیوں سے
آج تک ان کے دل دھڑکتے ہیں
زندگی کے بجھے ہوئے شعلے
اک نئی شان سے بھڑکتے ہیں

فصل کے ساتھ ساتھ کھیتوں سے
اُگ رہی ہے بغاوتوں کی سپاہ
جگمگاتی ہے عدل کی شمشیر
مل سکے گی نہ ظالموں کو پناہ

کارخانوں کے آہنی دل سے
ایک سیلاب سا اُبلتا ہے
سرخ پرچم ہوا کے سینے پر
بن کے رنگِ شفق مچلتا ہے

یہی ہندوستاں کا ساحل ہے
جس پہ ٹوٹا غرورِ سلطانی
آگ سی لگ گئی ہے پانی میں
موجیں کرتی ہیں شعلہ افشانی

© NCERT not to be republished

بادباں کھُل گئے بغاوت کے
بمبئی کے جہازیوں کو سلام
جو شہنشاہیت سے ٹکرائے
ایسے جاں باز غازیوں کو سلام

دیدنی اہلِ شہر کا ہے شکوہ
گولیاں روکتے ہیں سینوں پر
لب پہ نعرے، نگہ میں عزمِ جہاد
حُرّیت ضو فگن جبینوں پر

ہر سڑک پر سمندروں کا اُبال
ہر گلی میں ہے جوشِ طوفانی
غرق کردے گی بادشاہی کو
آدمی کے لہو کی طغیانی

(سردار جعفری)

© NCERT not to be republished

مشق

لفظ و معنی

آبشار	:	جھرنا
شمشیر	:	تلوار
آہنی	:	لوہے سے بنا ہوا
عزم	:	پختہ ارادہ
حرّیت	:	آزادی
ضوفگن	:	روشنی بکھیرنے والا
طغیانی	:	سیلاب، طوفانی کیفیت

غور کرنے کی بات

- اس نظم کے درج ذیل مرکبات دیکھیے

آہنگِ آبشار　　رنگِ شفق　　غرورِ سلطانی　　اہلِ شہر　　عزمِ جہاد

مرکّبات کی شکلیں ''مرکبِ اضافی'' کہلاتی ہیں۔ مرکبِ اضافی کے پہلے جز کو مضاف اور دوسرے جز کو مضاف الیہ کہتے ہیں۔ مضاف کے آخری حرف پر جو زیر ہوتا ہے اس کو ''کسرۂ اضافت'' کہا جاتا ہے۔ اردو میں مضاف الیہ کا ترجمہ پہلے اور مضاف کا ترجمہ بعد میں کرتے ہیں۔ درمیان میں موقع و محل کے لحاظ سے 'کا'، 'کی'، 'کے' کا اضافہ کرتے ہیں۔ مثلاً 'آہنگِ آبشار' کا ترجمہ ہوگا: جھرنے کا نغمہ

- ''وقت کا ترانہ' سردار جعفری کی ایک طویل نظم ہے۔ ''جاوید''، ''مریم''، ''فرنگی'' اور ''نامہ بر'' کے کرداروں کے ذریعے اس نظم کے مختلف اجزا ترتیب دیے گئے ہیں۔ پوری نظم آٹھ اجزا پر مشتمل ہے۔ پہلے جز کو ''حرفِ اول'' اور آخری جز کو

© NCERT not to be republished

''حرفِ آخر'' کا عنوان دیا گیا ہے۔ بقیہ درمیانی اجزا کے لیے ''پہلی تصویر''، ''دوسری تصویر'' جیسے عنوانات تجویز کیے گئے ہیں۔ پیش نظر اقتباس ''چوتھی تصویر'' میں بادشاہت کے خلاف انقلاب وبغاوت کی تصویر کشی کی گئی ہے۔

سوالات

1. ''کھیتوں سے بغاوتوں کی سپاہ اُگنے'' کا کیا مطلب ہے؟
2. ''سرخ پرچم'' کس بات کی علامت ہے؟
3. آدمی کے لہو کی طغیانی بادشاہت کو کس طرح غرق کر دے گی؟

عملی کام

- اس نظم کے کسی پسندیدہ بند کو یاد کر کے کاپی میں لکھیے۔
- اپنی کتاب سے مرکب اضافی کی پانچ مثالیں تلاش کر کے لکھیے۔

© NCERT not to be republished